مضرابِ غم

:- کلی صبائی -:

مضرابِ غم

یحییٰ بھائی

مضرابِ غم

یحییٰ بھائی اے جسدن والا

حالی پبلشنگ ہاؤس دہلی

آرٹسٹ ایشور داس

کاتب شیخ حسین شاہ آبادی (گلبرگہ)

بارِ اوّل اپریل سنہ ۱۹۵۹ء

تعداد ایک ہزار

طباعت جیّد برقی پریس دہلی

اِنتساب

اپنے دوستوں کے نام

سب اُن کی صحبتِ رنگیں کا فیض ہے ورنہ
کہاں زبانِ محبّت، کہاں بیانِ دل کا

یوں تو غم اور بھی جھیلے ہیں رہِ ہستی میں
جانے یہ کون سا غم ہے جو گراں ہے دل پر

ترتیب

قطعات

متفرق اشعار

تصاویر

عرضِ حال

اُردو ادب کے اِس نازک دَور میں کسی ایسے شاعر کو منظرِ عام پر لانا جو خود کو مشہور دیکھنا پسند نہ کرتا ہو اور اُس کو اہلِ نظر سے رُوشناس کرانے کی غرض سے اُس کے لختِ ہائے جگر کو یکجا کر کے ایک حَسین اور دیدہ زیب مجموعے کی شکل میں اُسکی اِشاعت کا اہتمام کرنا جوئے شیر لانے سے کم نہیں، لیکن اس "دیوانگیِ ذوق" کا کیا عِلاج کہ میں باوجود اپنی بے سروسامانی کے حضرت یحییٰ بھائی کے مجموعۂ کلام کی اِشاعت کا اہتمام کر کے رہا اور اب یہ آپ کے قدر دان ہاتھوں میں ہے، صاحبِ موصوف کے کلام کے متعلق کچھ لکھنا تحصیلِ حاصل ہے، مگر ہاں مجموعے کی ظاہری شکل وصورت اور اُس کو زیادہ سے زیادہ دیدہ زیب بنانے کے متعلق کچھ عرض کرنا ضروری سمجھتا ہوں۔ زیرِ نظر مجموعے کی کتابت ملک کے مشہور کاتب جناب شیخ حسین صاحب شاہ آبادی کے قلمِ جواہر رقم کی رہینِ منّت ہے، اور تصاویر بمبئی کے مشہور مُصوّر ایشور داس صاحب نے نہایت محنت سے تیار کی ہیں اور اِس طرح یہ حسین وجمیل شعری مرقع وجود میں آیا۔ لیکن تنہا یہ سب کچھ

کر گذرنا میرے لئے قطعی ناممکن ہوتا اگر حضرت یحییٰ بھائی کی ذاتِ گرامی میری مُمد اور معاون نہ ہوتی جس کے لئے میں صاحبِ موصوف کا تہہِ دل سے شکر گذار ہوں۔ نیز اس مجموعے کی تصحیح اور نظرِ ثانی کے سلسلہ میں اپنے دوست جناب ساحر بھوپالی کا بھی ممنون ہوں جنہوں نے میری مدد فرمائی۔

بدرالحسن جامعی

پیش لفظ

کشمکشِ حیات وہ حقیقت ہے جس سے مجالِ انکار نہیں اور یہ بھی مسلّم ہے کہ دورانِ کشمکش میں ہمیں مختلف منازل وادوار سے گذرنا ہوتا ہے۔ اِس کشمکش میں جو کچھ گذرتی ہے، اُسے مشاہدات یا محسوسات سے تعبیر کیا جاتا ہے جو آگے چل کر تعمیرِ شخصیت کی اساس یا بنیاد بن جاتے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ ہر جدوجہد کرنے والے کے اپنے زاویۂ نگاہ کے اعتبار سے اُس کے احساسات ومشاہدات مختلف ہوتے ہیں لیکن بنیادیں کوئی اختلاف نہیں۔ مسائلِ حیات وہی لیکن فکر کے طریقے مختلف، وہی شرابِ کہنہ مگر جام بدلتے رہتے ہیں۔ ہر صاحبِ فکر اپنی جاتی ہوئی دُنیا سے کچھ لیتا ہے جو اُس کا سرمایۂ حیات کہلاتا ہے۔ لینے والے کی یہ تمنّا ہوتی ہے کہ کسی طور پر اپنا گنجینۂ زیست آنے والی نسلوں کے لئے محفوظ کردے پھر فطرتِ انسانی چونکہ طوالت سے بیزار ہوتی ہے لہذا کوشش یہ رہتی ہے کہ گفتگو یا بیانِ حال کو اختصار کا جامہ پہنا دیا جائے۔ خصوصًا اِس دَور میں جبکہ کاروانِ زندگی بڑی تیزی سے گامزن ہے بات کا مختصر ہونا ہی دانشوری ہے، لیکن ایسا مختصر ہونا کہ اثر دُونا

ہو جائے ، اِس طرزِ بیان کیلئے شعر سے بہتر اور کیا ذریعہ ہو سکتا ہے؟

اگر دنیا کی ساری زبانوں کے لٹریچر پر عمیق نظر ڈالی جائے تو معلوم ہوگا کہ سیکڑوں کتابوں کے مواد کو ایک شعر نے اِس طرح ادا کر دیا کہ فکر کو حیرانی ہوتی ہے فکر کا تیز رَو رہوار کبھی کبھی اپنے دور سے آگے کی گفتگو کرتا ہے تو اربابِ عصر کو کچھ عجیب سا لگتا ہے اور وہ اس کو مفروضات اور خرافات پر محمول کر دیتے ہیں۔ انھیں خبر نہیں ہوتی کہ شاعر کن پیمبرانہ خصوصیات سے آراستہ ہو کر فکر کرتا ہے۔ آنے والا دور ثابت کر دیتا ہے کہ جن کو تصوّرات سمجھا جاتا تھا وہ حقائق نکلے، جیسا کہ اردو ادب پر گذر رہی ہے۔ بعض چیزیں اساتذۂ متقدمین نے پیش فرمائیں جن کو لوگ فرضی داستان سمجھ بیٹھے لیکن آج کے محیّر العقول سائنسی تجربات اور ارتقاء نے ثابت کر دیا کہ اکثر داستانیں حقیقت بہ داماں ہیں۔ شاعر کا کام زیادہ تر یہی ہے، کہ وہ اپنے محسوسات اور مشاہدات کو شعریت کا جامہ پہناتا ہے۔ وہ اپنے ماحول کا عکّاس ہوتا ہے۔ اور ظاہر ہے کہ ماحول سے ہٹ کر اُسے کہاں مشاہدات ملیں گے میں ایک ایسے ماحول میں سانس لے رہا ہوں جس میں رفتارِ حیات بہت تیز لیکن مستقبل غیر مُعیّن ہے۔ عجیب بات ہے کہ وقت کا دھارا غیر منقطع ہے۔ ماضی، حال اور مستقبل میں مکمل وابستگی ہے لیکن اس کے باوجود حسّاس دل و دماغ مستقبل کا اندازہ کرنے میں حیران ہیں۔ اور موجودہ دور اپنے ماضی سے منسلک ہوتے ہوئے بھی بے ربط سا معلوم ہوتا ہے اور اکثر لوگوں کو حالات سے تطابق پیدا کرنا محال

ہوگیا ہے - گو بہت سی چیزوں میں وہ اپنے آپ کو مطابق بنا لیتے ہیں پھر بھی زمانے سے اجنبیت سی محسوس ہوتی ہے - اور اسی بیسویں صدی میں سانس لیتے ہوئے میں بھی اپنے آپ کو ایسا ہی پاتا ہوں - اِس انقلابی دَور میں جب کہ ذہنِ انسانی فقط مادی تحقیقات میں مصروف ہے، سرد جنگ نے دنیا کو جاں بلب بنا دیا ہے - اِس کے باوجود ابنِ آدم کے زُعم میں زمانہ ترقی کر رہا ہے اور حضرتِ انسان کو زمین برباد کر کے چاند آباد کرنے کی فکر ہے - مسائل حیات وہی ہیں جو تھے بلکہ پیچیدہ تر ہوتے جا رہے ہیں - احساس اور ذہن کی کشمکش سے آدمیّت کراہ رہی ہے - دولت اور غربت کی اصطلاحات سے قطع نظر دُنیا نفرتوں اور عداوتوں میں خرمنِ سکون و حیات کو جلا رہی ہے - خواہ وہ یورپ کے سرمایہ دار ہوں یا غریبوں کے ٹھیکیدار دونوں مصنوعی سیّاروں اور راکٹس پر کروڑوں ڈالر صرف کر کے ایک دوسرے کو مرعوب کر رہے ہیں اور بیچارہ انسان چیخ رہا ہے کہ اے ناخداؤ! چلے تھے میرے مسائل کا حل ڈھونڈنے کیلئے لیکن زمین پر سِسکتا چھوڑ کر مجھے پستیوں میں ڈھکیل کر فکر و احساس کو نظر انداز کر کے مادّے کے سہارے آسمان پر کیوں چلے؟ کیا تم بدن کی بلندی ہی کو ترقی کہتے ہو؟ حالانکہ فقط بدن کو بلند کرنے والوں کی ذہنی موت ہوتی ہے - ذہن اور احساس ہی تو حیاتِ انسانی کی دلیل ہیں -

بہر حال ایسے ماحول میں میں نے ایک دھڑکتے حساس دل اور محبّت کا

سہارا لے کر احساسات اور ذہنی پریشانیوں کو ٹٹولنے کی کوشش کی ہے۔ خود میرا یہ شعر میرے مقصد کی وضاحت کرتا ہے۔

"میرے دل کی دھڑکن بھی اک جستجو ہے
کہیں بڑھ کے تیری صدا ہو نہ جائے"

نہ اُستاد ہونے کا مدعی اور نہ صاحبِ فن ہونے کا نعرہ۔ اپنے احساسات و مشاہدات کو شعریت میں پیش کر رہا ہوں۔ ہو سکتا ہے کہ اکثر اربابِ نظر اختلاف فرمائیں اور ضروری بھی نہیں ہے کہ ساری دنیا مجھ سے متفق ہو۔ آغاز میں عرض کر چکا ہوں کہ طرزِ فکر میں اختلاف کی نمایاں گنجائش ہوتی ہے۔ میں نے اپنی جاتی ہوئی دنیا سے جو کچھ لیا ہے وہ آنے والوں کیلئے محفوظ کرنیکی کوشش کر رہا ہوں۔ اگر بنی نوع انسان میں اس مجموعے سے ایک کو بھی کچھ ملا تو میری محنتوں کا نتیجہ واضح ہے۔

اب تک میں نے اپنی شاعری کے باطنی مفہوم کا ذکر کیا ہے لیکن شاعری صرف جذبات اور احساسات کے بیان کا نام ہی نہیں، اس بیان کا ایک مخصوص اسلوب بھی ہوتا ہے جسے فن کہتے ہیں اپنی فنی تکمیل کے معاملے میں اپنے اُستاد مُحترم جناب ساحرؔ بھوپالی کے لطف و کرم کا معترف ہوں جو مجھے مفید مشورے دیتے رہے اور میرے کلام پر اصلاح اور نظرِ ثانی فرماتے رہے۔ خصوصیت کیساتھ حضرت نیازؔ فتحپوری کا شکر گذار ہوں۔ اگر اُن کی ہمت افزائی کا شرف مجھے حاصل نہ ہوتا تو شائد میرے شعر و سخن کا سلسلہ جاری نہ رہ سکتا۔ نیز اُن تمام احباب کا بھی شکر گذار

ہوں جن کی پُرخلوص حوصلہ افزائی مجھے شعر کہنے پر آمادہ کرتی رہی -

آخر میں "حالی پبلشنگ ہاوس" کا شکریہ ادا کرنا بھی ضروری سمجھتا ہوں جس نے اُردو ادب کے اِس نازک دور میں میرے مجموعۂ کلام کی اشاعت کا بیڑا اٹھایا اور طباعت کا اہتمام کرتے وقت اپنے تجارتی مفاد کے مقابلے میں اپنے ذوق اور آرٹ کی خدمت کو ترجیح دی -

مُصنّف

اِعتراف و تعارف

جنابِ یحییٰؔ کا انتخابِ کلام "مضرابِ غم" میرے سامنے ہے اور میری سمجھ میں نہیں آتا کہ اظہارِ رائے کے لئے اِس کی کِس خصوصیت کو مرکزی حیثیت قرار دے کر گفتگو شروع کروں۔ شاعر کی ذہنی رفتار اور اُس کے تمام مظاہر کا ساتھ دینا آسان نہیں اور شائد ضروری بھی نہیں۔ تاہم اِس لحاظ سے اُنکے کلام کی "بوقلمونی" اور "چگونگی" کا مرکزی خیال وہی ایک ہے جسے "جذبۂ عشق و محبّت" کہتے ہیں۔ غالبًا اپنی "تنگ دامانیٔ خیال" کی معذرت پیش کرنیکی ضرورت مجھے پیش نہ آئے۔

اِس وقت جو کچھ لکھنا چاہتا ہوں وہ جنابِ یحییٰؔ کی شاعری کا کوئی تفصیلی جائزہ نہیں ہے اور نہ فنّی حیثیت سے اُس پر گفتگو کا موقع۔ لیکن سرسری مطالعہ کے بعد بھی میں اِس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اُنکی شاعری نہ الفاظ کی شاعری ہے، نہ صنائع و بدائع کی، بلکہ خالِص جذباتِ محبّت کی شاعری ہے جس کا خطاب صرف رُوح سے ہوتا ہے اور صرف ذوق ہی اُس سے خاموش لطف اُٹھا سکتا ہے۔

یہ مجموعہ اُن کے کلام کا انتخاب ہے اور مجھے اِس کا مطلق علم نہیں کہ یہ

انتخاب کس نے کیا ہے۔ تاہم اِس قدر ضرور جانتا ہوں کہ یہ انتخاب خود اُن کا کیا ہوا نہیں ہے اس لئے ہو سکتا ہے کہ اُن کے بعض پسندیدہ اشعار اِس مجموعہ میں شامل نہ ہو سکے ہوں۔ تاہم انتخاب اچھا ہے اور جناب یحییٰ کے ذوقِ سخن گوئی کی اچھی نمائندگی کرتا ہے

جناب یحییٰ خالص غزلگو شاعر ہیں اور نظم نگاری اُن کا فن نہیں۔ تاہم اِس مجموعہ میں سب سے پہلے اُن کی نظمیں ہی نظر آتی ہیں جو کمیّت کے لحاظ سے تو نہیں لیکن کیفیت کے لحاظ سے یقیناً قابلِ اعتنا ہیں۔ کیونکہ اُن کے مطالعہ سے شاعر کے حقیقی نظریۂ حیات پر کافی روشنی پڑتی ہے اور ہم اُن کی وساطت سے یہ معلوم کر سکتے ہیں کہ صاحبِ کلام کتنا دردمند دل اپنے پہلو میں رکھتا ہے اور ہئیتِ اجتماعی کے باب میں اُس کا نقطۂ نظر کس قدر وسیع و بلند ہے

پہلی نظم "صدائے درد" دراصل قومی مرثیہ ہے اور اُن کے دردمندانہ جذبات کا صحیح عکس اور دوسری نظم "معراجِ انسانیت" اِنہیں جذبات کا تبلیغی پہلو ہے۔ اور اِس لئے اِن دونوں نظموں کے ایک ساتھ مطالعہ کرنیکے بعد معلوم ہوتا ہے کہ جناب یحییٰ نہ صرف حسًّا و فکرًا بلکہ عملًا بھی زاویۂ نظر کس قدر وسیع رکھتے ہیں۔

جناب یحییٰ اُس طبقۂ خاص کے فرد ہیں جنھیں دوسروں کا حالِ دل سننے کی بھی فرصت کم ملتی ہے چہ جائیکہ خود اپنا دل دوسروں کے حال پر دُکھانا۔ لیکن غالبًا "اُنسان" پیدا ہونے کے لئے کوئی طبقہ مخصوص نہیں ہے اور فطرت کی یہ ودیعت ماحول و

اسباب کی پابند نہیں۔

اِس مجموعہ میں جنابِ یحییٰ کے "فردوجات" کا بھی کچھ انتخاب شامل ہے جس میں اُن کے جذباتِ انسانیت پرستی زیادہ نمایاں ہیں۔ اور اُن کے سامنے بے اختیار انسانی کرب و درد کی وہ دنیا آجاتی ہے ؎

"جہاں بستی ہے خزاں اور نہیں آتی ہے بہار"

اور زیست کا حاصل اُنھیں اِس طرح نظر آتا ہے کہ ؎

"ہر نظر خون میں ڈوبی ہے، ہر اِک چہرہ زرد"

یہاں تک کہ ذاتی طور پر وہ محسوس کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں کہ ؎

"ہر نظارہ نظر آتا ہے مجھے درد ہی درد"

اور ؎

"میں نے ہر درد کو سینے سے لگا رکھا ہے"

اِن اشعار کے بعد اُن کی غزلوں کا انتخاب شروع ہو جاتا ہے یعنی اُس صنفِ سُخن کا جس کے حُسن و قبح نہیں بلکہ ضروری و غیر ضروری ہونے پر بحث کی جاتی ہے۔ اِس لئے قبل اِس سے کہ ہم جنابِ یحییٰ کے ذوقِ تغزّل پر گفتگو کریں مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اِس مسئلہ پر بھی اِک نگاہ ڈال لی جائے" تاکہ غایتِ شاعری کی تعیین کے سلسلہ میں غزل کی افادیت یا عدم افادیت کے پیشِ نظر ہم جنابِ یحییٰ کی غزلگوئی پر صحیح تبصرہ کر سکیں

آج کل کلاسیکل غزلگوئی کے باب میں یہ بحث عام طور پر دیکھنے میں آتی ہے

کہ اِس کا زندگی سے کیا تعلق ہے اور اگر وہ ''ادب برائے ادب'' سے زیادہ کوئی حیثیت نہیں رکھتی تو اسے کیوں قابلِ اعتناء سمجھا جائے لیکن بد قسمتی سے اِس بحث میں کچھ ایسی اُلجھنیں پیدا کر دی جاتی ہیں کہ ادب اور زندگی دونوں کے نُقوش بجائے اُبھرنے کے اور زیادہ دُھندلے ہو جاتے ہیں۔

اس سلسلہ میں سب سے پہلے یہ منطقی سوال ہمارے سامنے آتا ہے کہ اگر ادب و زندگی دونوں ایک دوسرے سے علیٰحدہ ہیں تو

(۱) کیا وہ ایسے متوازی خطوط پر چل رہے ہیں کہ اُن کا اِتّصال کسی ایک نقطہ پر محال ہے۔

(۲) کیا اِن دونوں میں کوئی میلان یا جھکاؤ پایا جاتا ہے کہ وہ کسی حد تک پہونچ کر ایک دوسرے کو چھُو لیں اور پھر ایک ہی خطِ مستقیم میں تبدیل ہو جائیں۔

(۳) کیا ابتداء ہی سے اُن کی سمتِ رفتار ایک دوسرے سے اِس قدر مختلف ہے کہ اُن دونوں کا اِتّصال کسی طرح ممکن نہیں۔

ادب اور زندگی کے تعلق میں یہ فلسفہ طرازی و منطق آرائی میری سمجھ میں کبھی نہیں آئی۔ لیکن اس خیال سے کہ ممکن ہے کہ سلسلۂ بحث میں ادب اور زندگی کے کچھ نئے پہلو سامنے آجائیں میں نے ہمیشہ اِس کے سمجھنے کی کوشش کی اور ہمیشہ ناکام رہا۔ اِس کا سبب غالباً یہ ہے کہ زندگی کا جو مفہوم میرے سامنے ہے وہ اُس

مفہوم سے مختلف ہی۔ جو ہمارے ترقی پسند نقادانِ ادب و زندگی نے متعین کیا ہے۔
اُنکے یہاں زندگی کا مفہوم محض عملی حیثیت رکھتا ہے اور میرے یہاں خالص حسیاتی،
اُن کے سامنے مادی نقطۂ نظر ہے اور میرے سامنے روحانی و جذباتی۔ اُن کے
یہاں زندگی سے مراد کاروبارِ زندگی ہے اور میرے نزدیک صحیح شعورِ زندگی۔
وہ سب سے پہلے اُس کے معاشی پہلو کو دیکھتے ہیں اور میں اُس کے اخلاقی پہلو کو،
وہ ادب کو فکرِ سود و زیاں سے متعلق سمجھتے ہیں اور میں صالح و غیر صالح سے،
اُن کے نزدیک ادب اختیاری چیز ہے اور میرے نزدیک محض فطرت کا اِدّعا۔
اُن کے یہاں ادب کے لئے تدبیر و اہتمام کی ضرورت ہے اور میرے یہاں صرف
تقاضائے فطرت و الہام کی۔

وہ کہتے ہیں کہ اگر ادب کام کی باتوں سے خالی ہے تو لغو و مہمل چیز ہے۔
میں بھی یہی کہتا ہوں لیکن فرق یہ ہے کہ کام سے مراد اُن کی محض لذّتِ کام و دہن ہے،
اور میرے یہاں جمالیاتی ذوق کی تسکین!

الغرض میرے اُن کے نقطۂ نظر میں بڑا اختلاف ہے

تو گُل از باغ می جوئی، و من از گل باغ می جوئم

من از آتش دخان بینم، تو آتش از دخان بینی

میں سمجھتا ہوں کہ ادب، اس کی نوعیت خواہ کچھ بھی ہو، کسی نہ کسی مقصد سے ضرور
تعلق رکھتا ہے۔ اور یہ ضروری نہیں کہ وہ مقصد مادّی اور ٹیکنیکل ہو۔

یہ درست ہے کہ شاعری کو اپنے مقاصد کے لحاظ سے بہت وسیع و ہمہ گیر ہونا چاہیئے اور محض مخصوص جذبات کے لئے اسے وقف نہ ہو جانا چاہیئے لیکن ادب کی وسعت اُس کو مستلزم نہیں کہ اسے زندگی کی محض مادی اغراض سے وابستہ کردیا جائے اور اُس کا مقصود صرف ایک ہی مطالبہ اور ایک ہی آواز و آہنگ ہو، چنانچہ ہم دیکھتے ہیں کہ اُردو شاعری میں مختلف اصنافِ سخن کا تنوع مقاصد ہی کی وجہ سے وجود میں آئے۔ حرف و حکایت کے لئے مثنوی صیقلِ ذہانت کیلئے قصیدہ، پند و موعظت کے لئے رُباعی مخصوص ہو گئی اور غزل محض جمالیاتی ذوق کے لئے چُن لی گئی لیکن محض جنسی حیثیت سے نہیں، بلکہ ایک عام و وسیع ائتلافی جذبہ کی حیثیت سے جس کے بغیر زندگی کی کوئی گتھی نہیں سُلجھ سکتی، یہاں تک کہ سیاست ایسی خشک، غیر ادبی چیز بھی اُس وقت تک نہیں چل سکتی جب تک اُس کی بنیاد الفت و رافت پر قائم نہ ہو۔

اگر یہ صحیح ہے کہ انسان متمدن مخلوق ہے تو ہم اپنی زندگی کے کسی شعبہ میں خواہ وہ اخلاقی ہو یا مذہبی، تمدنی ہو یا سیاسی، معاشی ہو یا ادبی، کامیاب نہیں ہو سکتے تاوقتیکہ جذبۂ الفت و ہمدردی ہمارا ساتھ نہ دے، ہمارے دل میں نرمی و گداز کی کیفیت پیدا نہ ہو۔ اور اِس کیفیت کا ساتھ دینے والی دنیائے شاعری میں غزل کے سوا کوئی دوسری صنفِ سخن نہیں۔

موجودہ دَورِ جمہوریت میں بلند ترین جذبۂ انسانیت، آزادی و اخوتِ عامہ کا جذبہ سمجھا جاتا ہے اور اِس کے گرد تمام مسائلِ حیات گھومتے ہیں، لیکن کیا حصولِ آزادی

کا جذبہ کوئی انفرادی چیز ہے، کوئی طبقاتی احساس ہے، کیا وہ صرف کسان و مزدور ہی تک محدود ہے اور کیا طلبِ حقوق کے لئے یہ ضروری نہیں کہ جن سے حق طلب کیا جاتا ہی پہلے اُنکے دل میں جذبۂ رحم و انسانیت پیدا کیا جائے اور کیا تیغ و سنان کی مدد سے دائمی امن و سکون کی فضا پیدا کی جا سکتی ہی؟ کیا ہر دنیاوی تحریک عروج و ترقی کے باہمی تعاون کی ضرورت نہیں۔ اور اسکو بھی چھوڑیئے۔ خود نظامِ کائنات کا مطالعہ کیجئے۔ کیا وہ ائتلاف و اتحاد کے علاوہ کسی اور اصول پر قائم ہے۔ کیا زمین کے ایک ایک ذرّے سے لیکر بڑے بڑے اجرامِ سماوی تک قانونِ جذب و کشش کے علاوہ کوئی اور قانون کام کر رہا ہے ۔ اس لئے اگر ہم اہمیں دنیائے اخلاق کو بھی شامل کرلیں جو انسانیت کی حقیقی بنیاد ہے تو پھر جذبۂ محبت کی ضرورت اتنی اہمیت اختیار کرلیتی ہے کہ اس سے آنکھ چُرانا گویا حقائقِ زندگی اور اقتضاءِ فطرت سے آنکھ چرانا ہے۔

غزل کا شاعر اسی جذبہ کا پیامبر ہے، اِسی حقیقتِ کُبریٰ کا مُبلّغ ہی اور اِسی صداقتِ سرمدی کا علَم بردار — !

اِس میں شک نہیں کہ اسلوبِ بیان کے لحاظ سے کاروبارِ شاعری اِس وقت بہت وسیع و متنوع نظر آتا ہے لیکن غایت و مقصود کے لحاظ سے کوئی فرق نہیں ۔ بات وہی ایک ہے لیکن کہنے کے طریقے مختلف، اندازِ فکر وہی ہے لیکن رنگِ لباس جُدا جُدا، منزل وہی ایک ہے لیکن راہیں مختلف ؎

حُسنُكَ وَاحِدٌ وَعِبَارَاتُنَا شَتّٰی

غزل سے نفرت کرنے والا شاعر بھی وہی کہتا ہے جو کلاسیکل رنگ کا شاعر کسی وقت کہتا، اب بھی گفتگو کا پردہ دارانہ انداز وہی ہے جو پہلے تھا، نقاب اُلٹ کر سامنے آنا اب بھی زیادہ پسند نہیں کیا جاتا اور رموز و اشارات سے موجودہ ترقی پسند شاعری بے نیاز نہیں، لیکن کس قدر عجیب بات ہے کہ ایک کی گریباں چاکی و جامہ دریدگی تو حقیقت ہے، اور دوسرے کی بے برگ و باری خلافِ حقیقت۔ ایک کی آہ و فغاں تو سب کچھ ہو لیکن دوسرے کی آہ و زاری کچھ نہیں — !

حقیقت یہ ہے کہ ہمارے بعض نقادانِ فن نے اس کا اندازہ ہی نہیں کیا کہ موضوعِ شعر خواہ کچھ ہو لیکن جب تک وہ جذباتی حیثیت سے جمالیاتی ذوق کی تسکین کا باعث نہ ہو بالکل بے اثر چیز ہے اور اِس حقیقت کے پیشِ نظر اگر ہم تمام اصنافِ سخن میں کسی ایسی صنف کا انتخاب کرنا چاہیں جو واقعی بنیادی حیثیت رکھتی ہو تو ہم غزل کے علاوہ کسی اور صنف کا انتخاب نہ کر سکیں گے کیونکہ وہ زبان ہے اُن جذباتِ رأفت و محبّت کی جن سے اِنسانیت کی تعمیر ہوتی ہے اور داستان ہے اُن لطیف و پاکیزہ احساسات کی جنکو اگر زندگی کی معنویت کہا جائے تو یہ تعبیر غلط نہ ہوگی۔

ایک غزل گو شاعر اسی حقیقت کا داستان سرا ہے، اور اسی صداقت کا پرستار!

اِس میں شک نہیں کہ اسکے مدارج مختلف ہیں اور تعیینِ مدارج کا بھی ایک معیار ہے لیکن اس سلسلے میں اکثر و بیشتر محض الفاظ کو دیکھتے ہیں اور شاعر کے دل تک

پہونچنے کی کوشش نہیں کرتے، حالانکہ صحیح طریقہ یہی ہے کہ جذبات کے مطالعہ سے پہلے اُس دل تک پہونچا جائے جس سے وہ جذبات پیدا ہوئے ہیں اور شعر کے الفاظ پر غور کرنے سے قبل شاعر کی روح کو اچھی طرح سمجھ لیا جائے۔

جناب یحییٰ آہی کی غزلگوئی کا مطالعہ میں نے اِسی اصول کو سامنے رکھ کر کیا ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اُن کا مشغلۂ شعر گوئی محض اُن کی ذاتی فطرت کا تقاضا ہے اُن کے جذبۂ انسانیت پرستی کا ظہور ہے اور ایک ایسے دل کی آواز ہے جو کسی کے درد دکھ کی تاب نہیں لاسکتا — یہ روح رسمی شاعری میں ہمیں مشکل ہی سے کہیں مل سکتی ہے۔

جناب یحییٰ آہی کی غزلگوئی کلاسیکل غزلگوئی ہے اور اُس میں ہمکو تمام وہی رموز واشارات، تمام وہی کنایات وتعبیرات ملتے ہیں جن سے ہمارے کان آشنا ہیں، لیکن باوجود اِس کے ایک مخصوص انداز کی اِنفرادیت بھی ہم اُن کے کلام میں پاتے ہیں جس کا تعلّق الفاظ سے کم اور معنی سے زیادہ ہے اور اُس کا سبب غالباً یہ ہے کہ نہ وہ پیشہ ور شاعر ہیں اور نہ شاعری اُن کے لئے باعثِ فخر ہے۔

اُن کی شاعری دراصل اُن کے ناقابلِ ضبط جذبات کا اظہار ہے نمود ونمائش کے لئے نہیں بلکہ محض ذاتی تسکین کے لئے — اور — اگر انکی خلوتِ دل کے یہ رازاِس مجموعہ کی صورت میں ہمارے سامنے نہ آجاتے تو شائد کسی کو پتہ نہ چلتا کہ جناب یحییٰ آہی جب اپنی کاروباری غیر شاعرانہ زندگی سے گھبرا اُٹھتے ہیں تو رات کی تنہائیوں میں اِس کا ردِ عمل اُن پر کیا ہوتا ہے۔

جنابِ یحییٰؔ کا سارا کلام اِس وقت ہمارے سامنے نہیں ہے۔ اور انتخاب بھی غالباً خود اُن کا نہیں ہے، اس لئے ہم اُن کے تمام جہاتِ شاعری پر گفتگو نہیں کر سکتے، تاہم جو کچھ پیشِ نظر ہے اُسے دیکھ کر اس قدر سمجھا جا سکتا ہے کہ احساس کی بے چینیاں صرف "ویرانکدۂ غم" ہی تک محدود نہیں ہیں، بلکہ درد و کرب کی کروٹیں پھولوں کے سیج پر بھی لی جا سکتی ہیں اور دل کی کراہ محافلِ نشاط کے گوشوں سے بھی سنی جا سکتی ہے

جنابِ یحییٰؔ اُس طبقۂ خواص سے تعلّق رکھتے ہیں جن کو شاعری سے دلچسپی لینے کی ضرورت نہ فرصت، لیکن کسقدر عجیب بات ہے کہ انہیں اِس کی فرصت بھی مل جاتی ہے اور وہ اسے ضروری بھی سمجھتے ہیں — وہ اس لئے کہ اُن کی زندگی کا حقیقی مقصود دولت سے کھیلنا نہیں اور یہ اِس لئے کہ کبھی کبھی اُس سے منہ پھر لینا بھی اُن کے ذوق کو تسکین پہونچاتا ہے جیسا کہ خود انہوں نے ظاہر کیا ہے ؎

نشۂ مے میں سنبھلنا تو بہت آساں ہے،
مستیٔ زر میں رہے ہوش، بڑی مشکل ہے

اور جنابِ یحییٰؔ نے اِس مشکل منزل کو جس آسانی سے طے کیا ہے اِس کا ثبوت خود اُن کا مجموعۂ کلام ہے۔

جنابِ یحییٰؔ کو ذوق کی یہ پاکیزگی ورثہ میں ملی ہے یا خود اُن کی ذاتی صلاحیت سے تعلق رکھتی ہے، اس باب میں ہم یقین کے ساتھ کچھ نہیں کہہ سکتے، تاہم اِسقدر ضرور کہہ سکتے ہیں کہ وہ اکتسابی تو یقیناً نہیں ہے۔ اور اُن موہبات کے

عطا کرنے میں قدرت کسی خاص طریقہ کی پابند نہیں۔

جیسا کہ ابتداء میں ہم نے ظاہر کیا ہے اُن کی دو نظمیں بھی اس مجموعہ میں شامل ہیں۔ اور چند فردوجات بھی، لیکن اصل چیز اُن کی غزلگوئی ہے جس سے ہمیں اُن کے اصلی ذوق کے سمجھنے میں کافی مدد ملتی ہے۔

غزل کی دنیا اور اُس کے رموز و اشارات باوجود محدود ہونے کے بڑی وسعت اپنے اندر رکھتے ہیں اگر کوئی شاعر اپنی قدرتِ بیان سے واقعی اس کا احاطہ کر سکے اور یہ کہنا غالباً غلط نہ ہوگا کہ جناب یحییٰ کے بعض اشعار اُن کی وسعتِ نظر کی کافی نمائندگی کرتے ہیں۔ اِس کی چند مثالیں ملاحظہ ہوں:۔

١۔ عام طور پر دنیائے غزل میں محبت کو ایک خلشِ جستجو سے تعبیر کیا جاتا ہے اور اس کا ذکر عموماً جنسی سطح کو سامنے رکھ کر کیا جاتا ہے، لیکن ایک بلند نظر شاعر اِسی جذبہ کو آفاقی و ماورائی چیز بنا دیتا ہے۔ چنانچہ جناب یحییٰ اِسی خیال کو اس طرح ظاہر کرتے ہیں ؎

جُستجو سے ہمیں نجات ملی
تم ملے ساری کائنات ملی

چند سادہ و مختصر الفاظ میں جستجو کا فلسفہ، اس کی دشواریاں اور اُس کی غایت کو اتنی جامعیت کے ساتھ نظم کر دینا آسان نہ تھا اور اس کے ساتھ کنایتاً یہ بھی ظاہر کر دینا کہ "محبوب" کی ذات "خلاصۂ کائنات" ہے بڑی بالغ نظری کی بات ہے۔

۲- غالبؔ کا مشہور شعر ہے ؎

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں

جنابِ یحییٰؔ نے غالبؔ کے اِسی سوال کا جواب اِن الفاظ میں دیا ہے ؎

جب سے تم دل میں آن بیٹھے ہو
ہم کو نظّارہ سے نجات ملی

غالبؔ کو حیرت تھی کہ جب شاہد و مشہود ایک ہیں تو پھر مشاہدہ کیسا، نظّارہ کیوں؟ جنابِ یحییٰؔ نے ایک دوسرے زاویہ سے اِس خیال کو اِس طرح پیش کیا کہ شاہد و مشہود کا جھگڑا ہی ختم ہوگیا۔ اسی کے ساتھ "نظارہ سے نجات ملی" کا ٹکڑا کتنا بلیغ کنایہ ہے اِس حقیقت کی طرف کہ نظّارہ کی غایت محبوب سے نزدیک تر ہو جانا نہیں بلکہ خود محبوب کو اپنی طرف کھینچ لینا ہے۔

۳- کاروبارِ محبّت میں کبھی کبھی ایسی منزل سے بھی گذرنا پڑتا ہے جہاں اسباب و نتائج کا گذر نہیں اور تصوّر و تاثر کی توجیہہ کے لئے شاعر کو خود اپنا ایک نظریہ علیحدہ پیش کرنا پڑتا ہے جس کا تعلق منطقی افہام و تفہیم سے نہیں بلکہ خود اپنے ذاتی احساس سے ہوتا ہے، چنانچہ غالبؔ کہتا ہے ؎

شنیدہ ای کہ بہ آتش نہ سوخت ابراہیم
ببیں کہ بے شرر و شعلہ می توانم سوخت

جنابِ یحییٰ آ کا ایک شعر اِسی رنگ کا ملاحظہ ہو ؎

نہ دل میں درد ہی اُٹھا، نہ اُن کی یاد ہی آئی
بہار آنے کو آئی پر نئے انداز سے آئی

اِس شعر میں احساس کی تلخیوں اور ناکامیوں کو جس شگفتہ انداز سے پیش کیا گیا ہے اِس سے معلوم ہوتا ہے کہ "کارگاہِ محبّت" کی دشواریاں اُن کیلئے کسقدر گوارا ہیں

۴-۵- "متفرقات" میں اِن کے بعض اشعار نے مجھے بہت متاثر کیا مثلاً ؎

کہاں کا ضبطِ اَلم اور کہاں کا صبر و سکوں
ذرا جو اُس نے نظر کی، تو آنکھ بھر آئی

میں اُن کو ڈھونڈھنے نکلا تھا، لیکن خود کو کھو بیٹھا
کہاں لے آئی ہے یحییٰ آ مری دیوانگی مجھ کو

پہلے شعر میں ضبطِ الم اور صبر و سکوں کا منفی پہلو، جس حسن کے ساتھ پیش کیا گیا ہے، اور دوسرے شعر میں غایتِ جستجو کو جس لطافت سے ظاہر کیا گیا ہے اسکی داد نہ دینا ظلم ہے

۶- "پندارِ عشق" کا ذکر شعرا نے مختلف طریقوں سے کیا ہے، لیکن جنابِ یحییٰ آ نے اِس خیال کو جس سادگی و پُرکاری سے ظاہر کیا ہے اس سے یہ مفروضہ حقیقت و واقعیت میں تبدیل ہو جاتا ہے۔ لکھتے ہیں ؎

جُھکا کر سر کو تیرے آستاں پر
بڑھا دی میں نے قیمت سنگِ در کی

۷-۸- حیاتِ مختصر اور اس کے کوائف کی تعبیر تمام شعراء نے کی ہے اور مختلف پہلوؤں سے اپنے تاثرات ظاہر کئے ہیں۔ جنابِ یحییٰ کا اندازِ فکر بھی ملاحظہ ہو کتنی دلکش تعبیر ہے۔

سو جائے جیسے کوئی بیداریوں سے تھک کر
بس اتنا مختصر ہے افسانہ زندگی کا

اسی خیال کو دوسری جگہ انھوں نے اور زیادہ لطافت و خوبی کے ساتھ اس طرح ظاہر کیا ہے

نہ ہوش دل کا، نہ اپنی پروا، کوئی ٹھکانہ ہے بیخودی کا
یہ دردِ الفت، یہ اپنی ہستی ادھورا نغمہ ہے زندگی کا

فرق یہ ہے کہ پہلے شعر میں وہ فلسفیانہ نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے اور دوسرے شعر میں وہ خالص متغزلانہ ہے۔

۹- عشق و محبّت کی دنیا محض جذباتِ سپردگی و فتادگی کی دنیا ہے چنانچہ میرؔ کی شہرت کا انحصار تمامتر اسی پر قائم ہے۔ لیکن اس کے لئے بڑے سلیقہ کی ضرورت ہے۔ نفسیاتی نزاکت کا بڑا رکھ رکھاؤ ضروری ہے۔ شعر میں ذرا بھی تصنّع کا رنگ آیا اور سارا حُسن خاک میں مل گیا۔ سادگی، روانی، بیساختگی اور صداقت اُسکی جان ہے اور جنابِ یحییٰ نے جہاں کہیں اس قسم کے جذبات کا اظہار کیا ہے ان باتوں کا بڑا لحاظ رکھا ہے ؎

وہ نہ مانیں التجائیں، وہ نہ سمجھیں دردِ دل ؛؛ ہم تو رو رو کر یونہی اُنکو سناتے جائیں گے

۱۰- شعر کی بڑی خوبی یہ ہے کہ جذبات کے اظہار میں بڑی برجستگی و آمد ہو لیکن جب کبھی اس میں کوئی لطیف ابہام شامل ہو جاتا ہے تو یہ خوبی دوچند ہو جاتی ہے۔ جناب یحییٰ آہ کا ایک شعر ملاحظہ ہو ؎

تا ابد ہو ناز جس پر زیست کو
وہ محبّت کی گھڑی بھی آگئی

اِس شعر میں کسی جگہ اِس کا اظہار نہیں کیا گیا کہ شاعر محبّت کی کس گھڑی کا ذکر کرنا چاہتا ہے لیکن پہلے مصرعہ میں فقط زیست غمازی کر رہا ہے کہ وہ گھڑی جس پر زیست کو ناز ہو سکتا ہے دراصل وہی ہے جسے محبّت میں سُپردگی جان کہتے ہیں۔

۱۱- اِسی انداز کا ایک اور شعر سنیئے جس میں ضبطِ غم کا اِظہار بالکل نئے زاویہ سے کیا گیا ہے، کہتے ہیں ؎

موت سے بھی نہ ہو سکا جو فاش
زندگی کا وہ راز ہیں آنسو

آنسوؤں کو زندگی کا راز کہنا، اور پھر اس راز کا موت کے بعد افشا نہ ہو سکنا بڑا پاکیزہ درسِ محبّت ہے۔ معاملاتِ حُسن و عشق کی کوئی حد و انتہا نہیں اور وارداتِ محبّت کا بیان بہت کچھ شاعر کی نفسیات سے تعلق رکھتا ہے۔ پھر اس میں قید شورش و تحمّل کی ہے نہ ضبط و بیتابی کی — جو کیفیت بھی ہو شاعر کا نفسیاتی رجحان صرف واضح اثر انداز ہوتا ہے اور اس سے ہمیں یہ پتہ چلتا ہے کہ بلحاظِ جذبات کسی شاعر کا معیارِ تغزّل

کیا ہے جناب یحییٰ آہی کے چند اشعار ملاحظہ ہوں جن سے معلوم ہوتا ہے کہ وہ اِس باب میں کس متانت وسنجیدگی سے کام لیتے ہیں اور کیفیاتِ محبّت کے اظہار میں وہ تکلّف و تصنّع سے کس قدر دور رہتے ہیں ؎

۱۲- عشق کی قسمتِ محروم الٰہی توبہ
یہ بھی اب یاد نہیں ہمکو کہ کیا بھول گئے

خود فراموشی کا یہ عروج کہ "بھول جانا" بھی یاد نہ رہے، کس درجہ لطیف ارتقاء ہے۔

۱۳- اِسی رنگ کا ایک اور شعر ملاحظہ ہو ؎

راز جینے کا مرے وہ ہے کہ خود تم کو بھی
میں اگر چاہوں بتانا تو بتا بھی نہ سکوں

ضبط کا اظہار اِس انداز سے کہ اسے مجبوری بھی کہہ سکیں بڑی معنوی گہرائی اپنے اندر رکھتا ہے

۱۴- اِسی جذبہ کو زیادہ وسیع تر زاویہ سے یوں ظاہر کرتے ہیں ؎

اب سوچتا ہوں درد میں کیوں مبتلا ہوا
میرے لئے تو زندگی الزام ہوگئی

زندگی کو اتہامِ زندگی سے تعبیر کرنا بڑی لطافتِ فکر ہے۔

۱۵- محبوب کی بے اعتنائی کی شکایت تمام شعراء کا معمول ہے اور یہ مضمون بہت پامال سمجھا جاتا ہے لیکن جناب یحییٰ آہی اِس کو لطفِ زندگی اور جانِ تمنّا قرار دیتے ہیں ؎

وہ برہمی نہ رہی اب وہ بیرخی نہ رہی ٭ مزہ تھا جس سے طلب کا وہ بات ہی نہ رہی

شوق کا فلسفہ یہی ہے کہ آرزو پوری نہ ہو اور آرزو پوری نہ ہونے ہی پر اضطرابِ محبّت کا انحصار ہے۔

اُن کے کلام میں بیساختہ اندازِ بیان، لطفِ زبان اور والہانہ لب و لہجہ کے بھی بعض بڑے پاکیزہ اشعار نظر آتے ہیں مثلاً ؎

۱۶- دل کو سمجھاتا ہوں فرقت میں یہی کہہ کہہ کر
اب صبا آتی ہے، اب اُن کی خبر لاتی ہے

۱۷- یہ سُلوک اہلِ محبت سے بُرا کرتے ہو
آسرا توڑتے ہو دل کا یہ کیا کرتے ہو

۱۸- میں بھی آمادہ تھا کہنے کو، وہ سننے کیلئے
حالِ دل لب پہ مِرے پھر بھی بہ مشکل آیا

۱۹- مِلا کر مجھ سے نظریں مسکرا کر چل دیئے تم تو
یہاں بڑھتا گیا دردِ نہاں آہستہ آہستہ

یہ اشعار اپنی بندش، اپنی زبان، اپنی بیساختگی، اپنے لب و لہجہ اور معنویت کے لحاظ سے دبستانِ دہلی اور دبستانِ لکھنؤ کے اُس دَور کی چیز معلوم ہوتے ہیں جو داغ اور جلال کے ساتھ ختم ہو گیا۔

ہماری شاعری میں جذباتِ یاس و محرومی مختلف صورتوں میں ظاہر کئے جاتے ہیں، لیکن اُن کی سب سے دل نشین صورت یہ ہے کہ انہیں افسانوی دور سے متعلق کر دیا جائے۔

جنابِ یحییٰ نے بعض جگہ اِسی تعبیر سے کام لیا ہے اور بڑے حُسن کے ساتھ ملاحظہ ہو ؎

۲۰۔ بن گئی اب تو فسانہ ترے ملنے کی بات
زندگی دیکھئے پھر کب اُسے دُہراتی ہے

۲۱۔ تیری نظر جو بدلی زمانہ بدل گیا
عنواں کے ساتھ ساتھ فسانہ بدل گیا

پہلے شعر کے دوسرے مصرعہ کا مُستفسرانہ مگر مایوس لب و لہجہ اور دوسرے شعر میں "نگاہِ محبوب" کو مختلف افسانوں کا عنوان قرار دینا، بڑی پاکیزہ تعبیر ہے۔

اِسی طرح اُنہوں نے کیفیتِ انتظار کا اظہار اپنے دو شعروں میں مختلف زاویوں سے یوں کیا ہے ؎

۲۲۔ حاصلِ زندگی تھی بس وہ شب
جو ترے انتظار میں گذری

۲۳- عجیب چیز محبّت کا اعتبار بھی ہے
کہ تجھ سے شکوہ بھی ہے، تیرا انتظار بھی ہے

اِن اقتباسات سے جو یقیناً ناکافی ہیں پتہ چلتا ہے کہ جنابِ یحییٰؔ کا فطری وحقیقی رنگِ تغزّل کیا ہے اور وہ اپنے خیالات کے اظہار میں کس رکھ رکھاؤ سے کام لیتے ہیں۔

جنابِ یحییٰؔ بمبئی کے طبقۂ امراء سے تعلق رکھتے ہیں جس کو عموماً شعروشاعری سے لگاؤ نہیں ہوتا، اس لئے ہم کو حیرت ہوتی ہے کہ اُن میں یہ حسنِ ذوق کیوں کر پیدا ہوا اور اِس کی توجیہ اِس کے سوا کچھ نہیں ہو سکتی کہ ؎

ایں سعادت بزورِ بازو نیست!

نیازؔ فتحپوری

فنونِ لطیفہ فنکار اور فن پسند طبائع کے درمیان ایک رابطہ ہوتے ہیں۔ یہ رابطہ خصوصی بھی ہوتا ہے اور عمومی بھی، گہرا بھی اور سطحی بھی، مگر ہوتا ضرور ہے۔ اسلئے کہ ایک فنکار شاعری، مُصوّری، موسیقی اور بُت تراشی وغیرہ کے ذریعہ جہاں اپنی دِلی کیفیات، اپنے تجربات و مشاہدات کا اظہار و ابلاغ کرتا ہے، وہیں دوسروں کی زندگی کی عکّاسی بھی کرتا ہے۔

کچھ لوگ کسی فن کو محض اپنے ذوق و شوق کی تسکین کیلئے حاصِل کرتے ہیں اور کچھ بطور پیشہ۔ صورت خواہ کچھ بھی ہو لیکن واقعہ یہ ہے کہ فن قدر افزائی کے بغیر پنپ نہیں سکتا، فن کی قدر دانی فنکار کی حِس کو تیز کرتی ہے اور اُسے تحریک دیتی ہے خُوب سے خُوب تر کی۔ غالب کے ؎

"نہ ستائِش کی تمنّا نہ صلے کی پَروا"

میں جو نفی کا پہلو ملتا ہے وہ بھی دراصل ایک تیز خواہش ہے ستائِش و صلہ کی۔ اسکے بغیر کوئی فنکار آنیوالی نسلوں کیلئے بہتر فنّی سرمایہ تخلیق نہیں کرسکتا۔ اِسمیں

کوئی شک نہیں کہ فنکار کی صلاحیتیں خداداد ہوتی ہیں۔ وہ اپنے فن کی ابتداء بڑے معمولی طریقے سے کرتا ہے لیکن ہمت افزائی، قدردانی اور محاسن و معائب کی نشان دہی اُس میں اپنے فن کو نکھارنے اور سنوارنے کا جذبہ پیدا کردیتی ہے اُسکے خون کی گردش تیز ہوتی ہے، اُس کے ذہن کے دریچے کھلتے ہیں، وہ اپنے کمزور پہلوؤں پر غور کرتا ہے، اُس میں جوش و ولولہ پیدا ہوتا ہے اور نتیجہ میں وہ ایسے فن پارے تخلیق کرنیکے قابل ہوجاتا ہے جو عہد آفریں بھی ہوتے ہیں اور مستقبل آشنا بھی۔ کسی فنکار کے فن سے اگر چشم پوشی کی جائے، اظہارِ بے نیازی کیا جائے تو اُس کا فن ٹھٹھر جاتا ہے۔ اُسکے تخلیقی سوتے رُک جاتے ہیں۔ نہ نغموں میں جادو جاگتا ہے نہ شعروں میں کیف و اثر بیدار ہوتا ہے، نہ مرقعوں میں روح دوڑتی ہے اور نہ اُس کے تراشے ہوئے بُتوں میں زندگی پیدا ہوتی ہے۔ فن کسی درجہ کا بھی کیوں نہ ہو فطرتاً دوسروں کے پُرخلوص اظہارِ خیال کا متمنّی ہوتا ہے۔ شوق کو تو مہمیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ خواہ کتنا ہی رقیبِ سروساماں کیوں نہ ہو، پھر بھی اُسے سروسامان کی احتیاج ہوتی ہے۔

"ایں خانہ ہمہ آفتاب است" ـــــ کی میں نے اب تک اتنی روشن اور زندہ مثال شاذو نادر ہی دیکھی، پڑھی یا سُنی ہے، جیسی "مضرابِ غم" کے مصنّف کے خاندان میں پائی۔ بڑی حیران کُن بات ہے کہ یہ اعلیٰ تعلیم و تہذیب یافتہ کُنبہ جو ایک ہی خوبصورت عمارت میں آباد ہے، ایک طرف وسیع ترین اور عظیم

کاروباری زندگی کا حامل ہے تو دوسری طرف فنونِ لطیفہ میں سے بھی کسی نہ کسی کا شوقِ فراواں رکھتا ہے۔ یہی نہیں بلکہ اس شوق کی اس حد تک تکمیل و تحصیل کی گئی ہے کہ بڑے بڑے پیشہ ور فنکار اس خاندان کے افراد سے قربت میں فخر و مسرت محسوس کرتے ہیں۔

"مضرابِ غم" میں جس نے اپنے بے اختیارانہ جذبات و واردات کو شعروں کا روپ دیا ہے، وہ خود فنِ موسیقی کی بے پناہ معلومات رکھتا ہے۔ اسی کے ساتھ ہندوستانی سازوں میں سے ایک مشکل ترین ساز بجانے میں اپنا جواب نہیں رکھتا۔ اسکے برادرِ خورد "کلاسیکل موسیقی" کے ماہر و مخترع ہیں جنہیں ۳۵ سال تک مسلسل موسیقارِ اعظم استاد اللہ دیا خاں صاحب مرحوم نے تعلیم دی اور اپنے فن کی تمام رعنائی و توانائی اُنکے ذہن و قلب میں بھر دی۔ دوسرے چھوٹے بھائی "اسپورٹس" کی دنیا میں زبردست شہرت رکھتے ہیں۔ کرکٹ، باکسنگ اور بلیرڈ کا جہاں ذکر ہوتا ہے وہاں اُنکا نام ضرور لیا جاتا ہے۔ مصنف کا ایک لڑکا بہترین مصور ہے اُسکے دو مرقعے "مضرابِ غم" میں شامل ہیں۔ ایک بھتیجا فوٹو گرافی میں یدِ طولیٰ رکھتا ہے جس کی تصویریں بیرونی ممالک کے رسائل و اخبارات گرانقدر معاوضہ دیکر شائع کرتے ہیں۔ وہ ایک اچھا آرٹسٹ بھی ہے اور اُسے عہدِ عتیق کی نایاب دستکاریوں کو جمع کرنیکا زبردست شوق ہے۔ اگر یہ خاندان "براہیمی" نہ ہوتا تو "شوقِ آذری" سے بھی ضرور بہرہ ور ہوتا۔ کمی رہ گئی تو صرف اتنی ہی !!

کسی فنکار کے ماحول اور اسکی زندگی کے صحیح علم کے بغیر اُسکے فن کو نہیں سمجھا جاسکتا۔ اُردو ادب میں سب سے بڑی خرابی یہی ہے کہ اُسکے ادیبوں کے حالات کو سامنے نہیں رکھا جاتا، محض اُنکے پیدا کردہ ادب پر حکم لگا دیا جاتا ہے۔ "مضرابِ غم" پر مولانا نیاز فتحپوری نے خاصی تفصیل سے اظہارِ خیال فرمایا ہے۔ میں اُن سے اکثر مقامات پر متفق ہوں۔ میرے نزدیک کلام پر اظہارِ خیال سے زیادہ یہ بات ضروری تھی کہ میں قاری کیلئے وہ پس منظر پیش کردوں جس میں "مضرابِ غم" کے مصنّف کی شاعری کو دیکھا جاسکے۔ اس مجموعہ کی اشاعت پر مصنّف کی ہمّت افزائی اُسے خوب سے خوب ترکی طرف لانے میں یقیناً معاون ہوگی اور وہ اپنی مصروف ترین زندگی میں سے کچھ وقت ادب و شعر کیلئے دیکر ایک طرف اپنے شوق کی پذیرائی کرسکے گا تو دوسری طرف اُردو زبان کو بھی ایک سہارا ملتا رہے گا۔

یُوں اُسے اپنی شعری تخلیقات پر یقین و اعتماد ہے۔ یقین و اعتماد ہی نہیں بلکہ اُس کے یقینِ عشق نے اُس کے احساسِ فنا کو بھُلا دیا ہے۔ وہ کہتا ہے ؎

ترے جلووں کے تصدّق، مجھے محوِ دید کر کے
وہ یقینِ عشق بخشا کہ بھُلا دیا فنا کو

اعجاز صدّیقی
(مدیر ماہنامہ "شاعر")

بمبئی
۷ جون ۱۹۵۹ء

○

نظمیں

مِعراجِ اِنسانیت

پھُول فطرت نے کھلائے ہیں گلستانوں میں
اور کانٹے بھی اُگائے ہیں بیابانوں میں
طرحداری میں ہے ہر پھُول سوا ایک سے ایک
رنگ اور بو میں ہے ہر پھول جُدا ایک سے ایک
ایسا ہی حال ہے دُنیا میں کچھ انسانوں کا
کچھ عجب ڈھنگ ہے اِن سوختہ سامانوں کا
دامنِ دہر میں کھوٹے اور کھرے دونوں ہیں
اِس کی آغوش میں اچھّے اور بُرے دونوں ہیں

ایک پیدا ہوا نازک سی طبیعت لے کر

ایک پیدا ہوا پتّھر کی سی خصلت لے کر

اُس کی قسمت میں ہے خود اپنی ادا پر مٹنا

اِس کی قسمت میں ہے طوفانوں میں پلتے رہنا

ایک وہ جس نے کیا خود کو بہاروں پہ نثار

دوسرا وہ کہ خزاں میں بھی رہی جس پہ بہار

ایک سرمستِ جوانی ہی رہا دنیا میں

دوسرا غم کا عَلَم لے کے اُٹھا دنیا میں

دھجّیاں غم کی اُڑا دیں جو گریبانوں کی

ملک کو آج ضرورت ہے اُن انسانوں کی

بے سر ہو جن کو تمنّاؤں سے ارمانوں سے

کھیلیں بربادی سے ٹکرائیں جو طوفانوں سے

آہِ دِل دوز میں تاثیر و اثر رکھتے ہوں
دِل جو پتھر کا تو لوہے کا جگر رکھتے ہوں
شمع کی طرح جو ہر حال میں جلتے جائیں
موم کی طرح جو ہر سانچے میں ڈھلتے جائیں
ایک ہو جن کی نگاہوں میں خزاں اور بہار
جن کا دل رہتا ہو ہر حال میں عشرت بہ کنار
اُن سے بدلے جو زمانہ تو بدل جاتے ہوں
طفلِ سرکش کی طرح ضد سے مچل جاتے ہوں
اپنی ہی آگ میں جو آپ ہی جلتے جائیں
خود ہی جو ٹھوکریں کھا کھا کے سنبھلتے جائیں
اُن ہی کے ہاتھ میں بس لاج ہے اِنسانوں کی
حق پہ مٹ جانا ہی معراج ہے اِنسانوں کی

صدائے درد

کیسی برپا ہے زمانے میں قیامت یاربؐ
کیوں ہے انساں کو انساں سے نفرت یاربؐ
ایک سے ایک ہے بیزار ترے بندوں میں
کیا ہوا اِن کا وہ احساسِ محبّت یاربؐ

ہر مسلماں کے دِل میں ہے کدُورت یارب
بھائی کو بھائی سے ہے کیسی عداوت یاربؐ
نہ حیا اِن میں، نہ احساس ہے کچھ ذِلّت کا
کیا یہی ہے ترے محبوب کی اُمّت یاربؐ

سیکڑوں فرقے ہیں ہر اک کا کعبہ ہے الگ
اِن کا ساحل ہی الگ، اُن کا کنارہ ہے الگ
یہ تو ظاہر ہے کہ سب ایک ہی اُمّت میں ہیں
پھر یہ کیا قہر ہے ہر اِک کی تمنّا ہے الگ

نہ شرافت ہے، نہ اخلاق کی دولت اِن میں
آگئی سارے زمانے کی جہالت اِن میں
ہیں یہ ظاہر میں مسلمان بھی، کلمہ گو بھی
لیکن اب نام کو باقی نہیں غیرت اِن میں

ہائے کس مُنہ سے کہوں اِن کو کہ اِنساں ہیں یہ
خود غرض ہوتے ہوئے صاحبِ ایماں ہیں یہ
سر سے پا تک تو یہ ڈوبے ہیں ریاکاری میں
پھر بھی یہ زعم ہے اِن کو کہ مسلماں ہیں یہ

اب نہ عزّت رہی دُنیا میں نہ دولت باقی
ہیں مسلماں، مگر اب شان نہ شوکت باقی

اب رواداری ہے اِن میں نہ وفاداری ہے
اپنوں کے واسطے بس دِل میں ہے نفرت باقی

اپنے شیداؤں کی عزّت پہ کرم کر یارب
دردمندوں کی محبّت پہ کرم کر یارب
اِلتجا ہے یہی یحییٰؔ کی بصد عجز و نیاز
اپنے محبوب کی اُمّت پہ کرم کر یارب

شانِ اِسلام کی دُنیا میں نمایاں کر دے
دردِ اُلفت دے اِنھیں، صاحبِ ایماں کر دے
پنجتن پاک کے صدقے میں کرم کر اِن پر
مِرے مولےٰ تو اِنھیں پھر سے مسلماں کر دے

غزلیں

جہاں بن بن کے اِک اِک آس دل کی ٹوٹ جاتی ہے
وہیں قسمت کھڑی بے چارگی پر مُسکراتی ہے

غمِ اُلفت کے ہاتھوں جو مٹا بے آسرا ہو کر
اُسی پامالِ غم کو ہائے اَب دنیا ستاتی ہے

غمِ فرقت سے جب گھبرا کے خود سے رُوٹھ جاتا ہوں
تمہاری یاد پھر کِس طرح مجھ کو مناتی ہے

وہیں پیدا ہوا کرتا ہے بحرِ عشق کا ساحل
اُبھر کر کشتیٔ حسرت جہاں پر ڈوب جاتی ہے

کہاں رہتا ہے پھر قابو دلِ ناکام پر مجھ کو
کہ جب رہ رہ کے تنہائی میں تیری یاد آتی ہے

ہمہ تن منتظر تو ہوں وفورِ شوق میں لیکن
مگر اب دیکھئے اُن کی تجلّی کیا دکھاتی ہے

ہے اِنہی کے دم سے قائم مِرے درد کی جوانی

مِری بیقرار آہیں، ترے غم کی ہیں نشانی

نہ لبوں پہ میرے نالہ، نہ وہ اشک کی روانی

کوئی کیسے پھر سمجھ لے مِرا رازِ بے زبانی

ابھی دِن شباب کے تھے کہ وہ مجھ سے رُوٹھ بیٹھے

ابھی میں مَنا رہا تھا کہ گذر گئی جوانی

کوئی آسرا تو دیتے مِرے غم کی بے کسی کو

کبھی کاش آپ سنتے مِری دُکھ بھری کہانی

تِرا دیکھنا وہ مجھ کو بہ نگاہِ یاس و حسرت

میں تو عرضِ شوق کرتا مگر ہائے ناتوانی

نہ خبر لی اُس نے بھی کبھی بھول کر بھی دل کی
مٹی جس کی آرزو میں مری ساری زندگانی

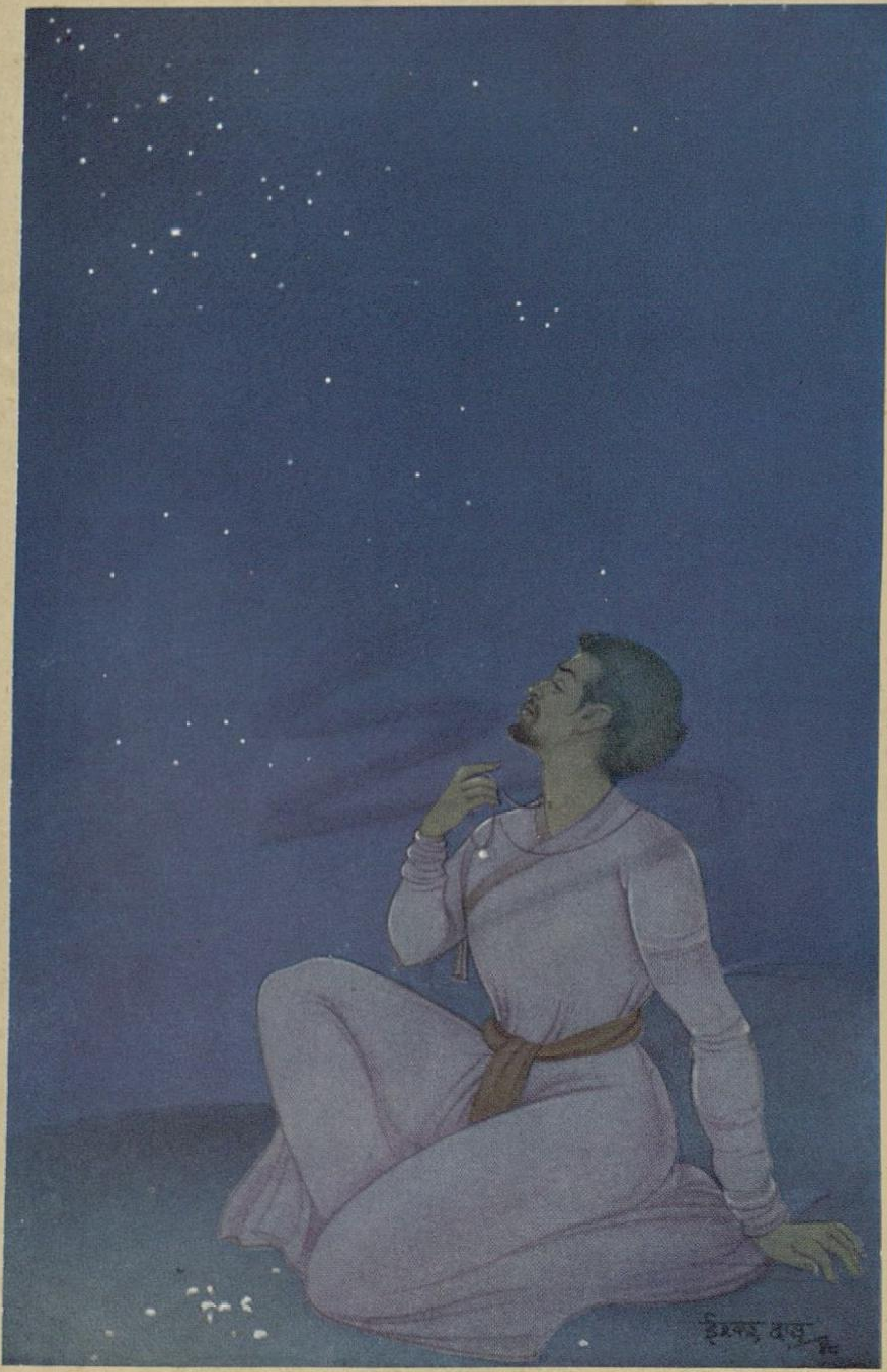
رُسوا نہ کہیں غم ہو جائے، اے اشکِ ندامت واپس ہو
برباد تمنّا رہنے دے، او ننگِ محبّت واپس ہو

وہ مِل کے جُدا تو ہو ہی چکے، اب غم کا مداوا کیا ہو گا
اے درد یہ اب ناممکن ہے کہ آ کے قیامت واپس ہو

برباد یونہی اب رہنے دے، ہیں لطف و کرم سے باز آیا
اللہ نہ کرے کہ پھر تیرا، وہ دورِ عنایت واپس ہو

اِک چشمِ عنایت جب تیری، یحییٰ کی وفا کا بدلہ ہو
پھر دَر سے ترے کیوں آزردہ، بربادِ محبّت واپس ہو

دل میں وفورِ شوق کا طوفاں لئے ہوئے
خاموش جاگتا ہوں ستاروں کے ساتھ ساتھ



اِک بے کسی ہے ہجر کے ماروں کے ساتھ ساتھ
ٹوٹا ہے میرا دِل بھی سہاروں کے ساتھ ساتھ

دِل میں وفورِ شوق کا طوفاں لئے ہوئے
خاموش جاگتا ہوں ستاروں کے ساتھ ساتھ

جی بھر کے دیکھنے بھی نہ پائے کہ چھُپ گئے
ارماں بھی ہیں اُداس نظاروں کے ساتھ ساتھ

اِتنی تو محویّت ہو تصوّر میں تیرے دوست
خود کو بھی بھول جاؤں نظاروں کے ساتھ ساتھ

یحییٰ یہ آگ عشق کی پھر بھی نہ بُجھ سکی
ہیں دِل میں اشکِ غم بھی شراروں کے ساتھ ساتھ

نہ ہوش دِل کا نہ اپنی پروا، کوئی ٹھکانا ہی بیخودی کا
یہ دردِ الفت یہ میری ہستی، ادھورا نغمہ ہے زندگی کا

زمانے سے کیوں شکایتیں ہوں، گلہ ہو قسمت کا کس لئے اب
ہوئے ہیں جب جان بوجھ کر ہی شکار ہم اپنی بے کسی کا

ہزار غم اور ایک دِل ہے، جیوں تو کیوں کر مروں تو کیونکر
اگر ہو ممکن تو کس طرح ہو، علاج ہر اک کی بے بسی کا

لرز رہا ہوں تڑپ رہا ہوں، یہ اشکِ حسرت یہ آہِ سوزاں
کہ حشر کیا ہو گا بعد میرے، اے ہمنشیں تیری زندگی کا

ہزار پردوں میں چھپ کے بھی اب، جھلک رہا ہی جمالِ رنگیں
یہ شعر تیرے نہیں ہیں یحییٰ، نچوڑ ہے تیری زندگی کا

شاملِ حال ہو گر تیری رضا تھوڑی سی

ہم بھی کر لیں ترے ملنے کی دُعا تھوڑی سی

روز افزوں ہی رہے تا بہ ابد جس کا خُمار

میرے ساقی وہ مئے عشق پلا تھوڑی سی

ہائے کیا چیز ہے نیرنگیِ حُسنِ دل بر

شوخیوں میں بھی جھلکتی ہے حیا تھوڑی سی

بے پناہی ترے جلوؤں کی مُسلّم اے دوست

طاقتِ دید بھی ہو جائے عطا تھوڑی سی

جُراتِ دید پہ کس واسطے ہوتے ہو خفا

ہو ہی جاتی ہے مُحبّت میں خطا تھوڑی سی

لطف آجائے طلبگاری و دِلداری کا
کر کے دیکھو تو کبھی ہم سے وفا تھوڑی سی

گر تو منزل پہ نہ پہنچا نہ سہی اے تحسینؔ
لے اُڑی خاک تری بادِ صبا تھوڑی سی

جسے کوئی بھی نہ مٹا سکے میں وہ غم کا نقشِ وقار ہوں
جسے کوئی بھی نہ بجھا سکے، میں وہ شمعِ محفلِ یار ہوں

مرے غم میں خود کو مٹائے کیوں، گلے اپنے مجھ کو لگائے کیوں
مجھے اپنا کوئی بنائے کیوں، میں تو بے کسی کا شکار ہوں

مجھے بے سہارا کئے ہوئے، مری ہر خوشی کو لئے ہوئے
وہ جہاں سے ہو کے گذر گئے، اُسی رہ گذر کا غبار ہوں

جسے مٹ کے بھی میں نہ پا سکا، جسے میں نہ اپنا بنا سکا
میں اُسی کے دل کا ہوں مدّعا، میں اُسی کے دل کی پکار ہوں

مجھے اُس کے غم سے ہے رابطہ، مجھے یحییٰ اُس سے ہے واسطہ
جو وفا کی راہ میں مٹ گیا، میں اُسی کا صبر و قرار ہوں

تیری نظر جو بدلی زمانہ بدل گیا
عنواں کے ساتھ ساتھ فسانہ بدل گیا

اب اُن کو کوئی بات گوارا نہیں مری
وہ لطف اور کرم کا زمانہ بدل گیا

پہلی سی اب نہیں ہے، وہ لذّتِ حیات میں
شاید تری نظر کا نشانہ بدل گیا

وقتِ نشاط آ گئی جب یادِ بیکسی
آتے ہی آتے لب پہ ترانہ بدل گیا

پُرسانِ حال کوئی نہیں ہے، وفاؤں کا
یکتیؔ یہ کیسا رنگِ زمانہ بدل گیا

ہر ادا ان کی مرے حق میں جنوں ساز رہی
راز کی بات جو تھی حشر تلک راز رہی

شبِ فرقت کی فضا گوش بر آواز رہی
ہر رگِ دل مری اِک نغمۂ بے ساز رہی

کب گھٹا چھائی، نہ جب دل میں رہی کوئی امنگ
کب بہار آئی، نہ جب طاقتِ پرواز رہی

آپ ہی آئے نظر مجھ کو مری ہستی میں
دل کی دھڑکن میں چھپی آپ کی آواز رہی

میں نے چھیڑا نہ کبھی نغمۂ غم اے یحییٰ
اُن کی معصوم نظر طالبِ آغاز رہی

ولولے شوق کے جب ذوقِ نظر تک پہنچے
آرزو دل میں لئے آپ کے در تک پہنچے

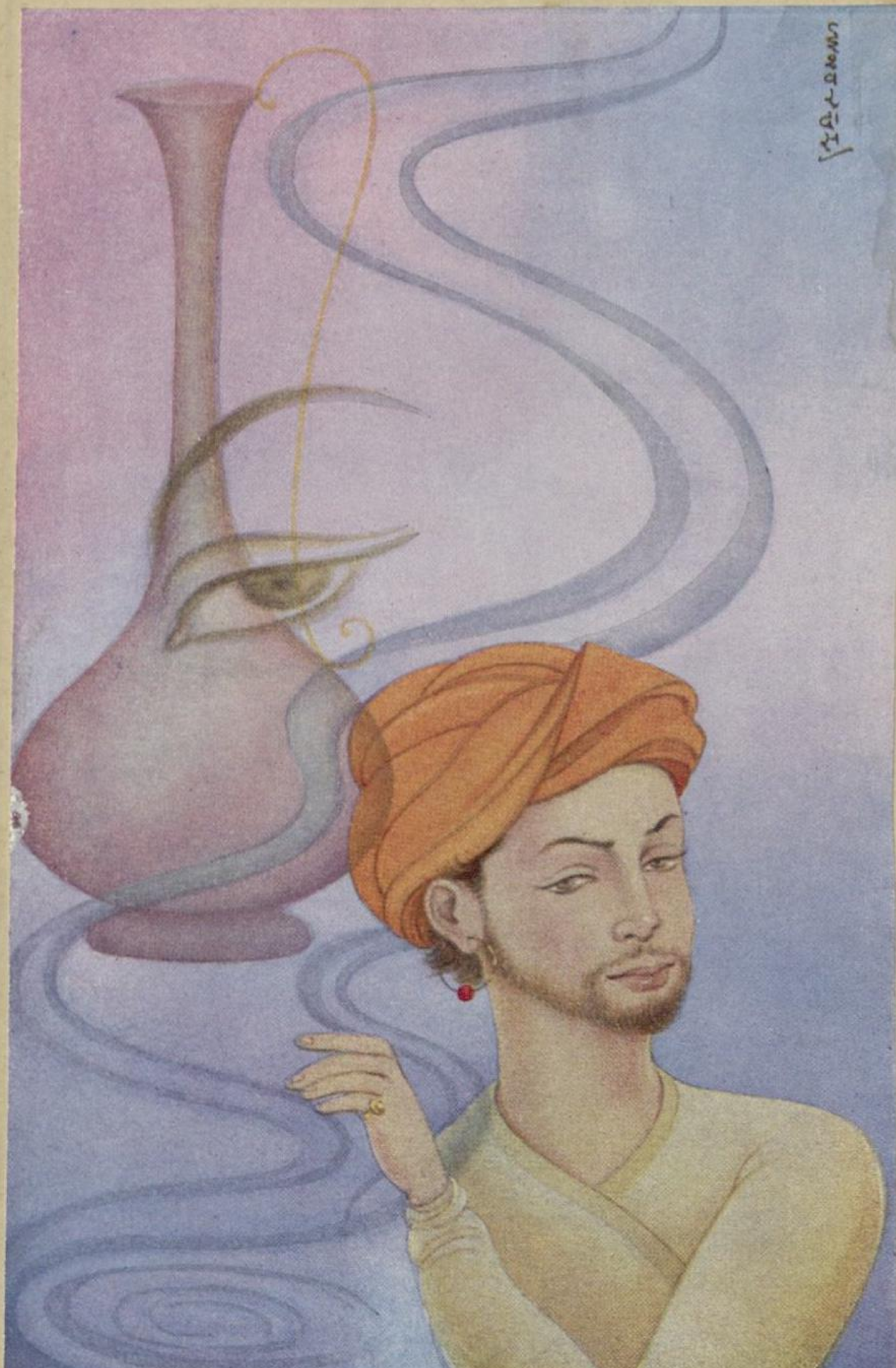
یوں چھپاتا ہوں میں اشکوں کو بھری محفل میں
منظرِ غم نہ کہیں اُن کی نظر تک پہنچے

شاملِ حال نہ ہو آپ کا گر لطف و کرم
حشر تک بھی نہ دُعا بابِ اثر تک پہنچے

کہیں مٹ جائے نہ یہ لذتِ دردِ فرقت
شامِ غم میری الٰہی نہ سحر تک پہنچے

قصّہ حسن نہ چھیڑو مجھے ڈر ہے یحییٰ
بات بڑھ کر نہ کہیں دردِ جگر تک پہنچے

مجھے مست گر بنا دے یہ نگاہِ مست تیری
مرا ہاتھ کیا نظر بھی، کبھی جام تک نہ پہنچے



رہِ عاشقی کے مارے رہِ عام تک نہ پہنچے
کبھی صبح تک نہ آئے کبھی شام تک نہ پہنچے

مجھے مست گر بنا دے یہ نگاہِ مست تیری
مرا ہاتھ کیا نظر بھی، کبھی جام تک نہ پہنچے

جو یہ دورِ بے وفا ہے ترا غم تو مستقل ہو
وہ حیاتِ عاشقی کیا جو دوام تک نہ پہنچے

تمھیں کوئی کیسے سمجھے تمھیں کوئی کیسے جانے
کبھی خامشی سے نوبت جو کلام تک نہ پہنچے

مجھے اپنی بے کسی کا نہیں غم خیال یہ ہے
کہیں بات بڑھتے بڑھتے ترے نام تک نہ پہنچے

کہیں اس طرح بھی روٹھے نہ کسی سے کوئی جیسے

کہ پیام تک نہ آئے کہ سلام تک نہ پہنچے

ہر خوشی میں غم ہے ، ہر غم میں خوشی میرے لئے
لائی ہے تحفہ یہ میری زندگی میرے لئے

عرضِ غم کی لاج رکھتا کون ، گر ہوتے نہ تم
بے تمہارے زندگانی بار تھی میرے لئے

وہ تو یہ کہئے اماں دیدی تمہاری یاد نے
جانے کیا کرنے کو تھی بد قسمتی میرے لئے

تم ہی جینے کا سبب ہو اس جہانِ یاس میں
موت سے بدتر تھی ورنہ زندگی میرے لئے

ہے دعا یحییٰ کی یارب تو اسے کر لے قبول
اُن کی مرضی میں ہو پنہاں ہر خوشی میرے لئے

کیوں میری مُحبّت کے بدلے ، تم مجھ سے نفرت کر بیٹھے
میں تم سے کرم کا طالب تھا ، تم مجھ سے عداوت کر بیٹھے

دوبارہ بساؤں اَب کیسے ، اِن دردِ وفا کے ماروں کو
ارماں تھے جتنے تنگ آ کر ، جب دل ہی سے ہجرت کر بیٹھے

پہلے ہی سے تھے ہم تو رسوا ، پھر اُس پہ غضب یہ اور ہوا
نظروں سے وہ بہکا کر دل کو ، اک اور شرارت کر بیٹھے

اب جان کی کس کو پروا ہے ، جب آبروِ غم کی رکھنے کو
تقدیر سے بے پَروا ہو کر ، ہم عزمِ مُحبّت کر بیٹھے

صد آفریں تم پر اے یحییٰ جو عزمِ تباہی تم نے کیا
کہ اُن کو ستم گر جان کے بھی تم عہدِ مُحبّت کر بیٹھے

عاشقی خاک اڑائے گی یہاں میرے بعد
اور ہو جائے گا یہ رنگِ جہاں میرے بعد

ہو گا ممکن نہ کسی سے بھی یہاں ذکرِ وفا
کون پائے گا یہ تاثیرِ بیاں میرے بعد

میں تو اٹھ جاؤں گا دنیا سے مگر یہ غم ہے
حشر کیا ہو گا ترا جانِ جہاں میرے بعد

ہو گا چارہ نہ کوئی اور تڑپنے کے سوا
رنگ دکھلائے گی جب میری فغاں میرے بعد

جانے کیا عشق پہ گذرے گی جہاں میں یحییٰ
کس سے اُٹھ سکتا ہے یہ بارِ گراں میرے بعد

غیروں کو مجھ پہ ہنسنے کا موقع دیا گیا
میری وفا کا خوب یہ بدلہ دیا گیا

بے چارگی سے دل کی رگیں کھنچ کے رہ گئیں
جب التجائے شوق کو ٹھکرا دیا گیا

ہنس ہنس کے مجھکو دیکھتے ہیں بزم میں رقیب
جب بے رخی سے شوق کا بدلا دیا گیا

سمجھا کہ آفتاب گہن سے نکل گیا
چہرے سے جب نقاب کو سرکا دیا گیا

اس طرزِ التفات کو یحییٰ میں کیا کہوں
امید دے کے درد کو بہلا دیا گیا

سب کچھ لُٹا چکا ہے دیوانہ زندگی کا
کر لو قُبول اب تو نذرانہ زندگی کا

رہنے دے اپنی باتیں اپنے ہی تک اے ناصح
آساں نہیں ہے ایسا سمجھانا زندگی کا

سو جائے جیسے کوئی بیداریوں سے تھک کر
بس اِتنا مختصر ہے افسانہ زندگی کا

ہر چند باخبر تھا انجامِ غم سے لیکن
منزِل پہ آ ہی نِکلا دیوانہ زندگی کا

تسلیم اور رضا ہے اِک مصلِحت کی خاطر
آتا ہے ورنہ مجھ کو بہلانا زندگی کا

ایسا عمل سے تم نے اُلجھایا زندگی کو
باتوں سے اَب ہے مشکل سُلجھانا زندگی کا

دل اور دماغ دونوں قابو میں رکھیئے یکجی آ
آباد ہے اِنہی سے کاشانہ زندگی کا

آکر وہ سامنے مِرے کترا کے چلدیئے
دل کی لگی کو اور بھی بھڑکا کے چلدیئے

ڈالی جو ایک بار تو اُٹھی نہ پھر نقاب
وہ آرزوئے دید کو ترسا کے چلدیئے

ہنس ہنس کے کر رہے تھے وہ غیروں سے گفتگو
نظریں ملیں جو مجھ سے تو گھبرا کے چلدیئے

مانی نہ میری ایک بھی اور اِس پہ یہ ستم
باتوں ہی باتوں میں مجھے بہلا کے چلدیئے

نکلے جو پاس سے مرا پہلو دبا دیا
جوشِ جنوں کو اور بھی گرما کے چلدیئے

پیچی شرابِ حُسن سے مخمور کر کے وہ
آنکھوں میں آنکھیں ڈال کے بہکا کے چل دیئے

مٹتے مٹتے بھی یونہی ہم مُسکراتے جائیں گے
جس طرح ہوگا وقارِ غم بڑھاتے جائیں گے

زندگی کو اب سنواریں گے اِسی صُورت سے ہم
کُل جہاں کے درد کو اپنا بناتے جائیں گے

تم سُنو یا مت سُنو مرضی تمہاری ہے مگر
دردِ دِل کی داستاں ہم تو سناتے جائیں گے

بے رُخی سے وار کرو بے وفا ہم بھی یہاں
دِل کے زخموں سے نئی دُنیا بساتے جائیں گے

وہ نہ مانیں اِلتجائیں، وہ نہ سمجھیں دردِ دل
ہم تو رو رو کر یونہی اُن کو سُناتے جائیں گے

جھیل کر صدمے پہ صدمے دل پہ اے یحییٰ اِسے
درد سہنے کا یونہی عادی بناتے جائیں گے

یہ سُلوک اہلِ محبت سے بُرا کرتے ہو
آسرا توڑتے ہو دِل کا یہ کیا کرتے ہو

کر کے شِکوہ تمہیں، کب میں نے پشیمان کیا
میرے ہوتے ہوئے کیوں ترکِ جفا کرتے ہو

ٹال دیتے ہو ہر اک بات مری ہنس ہنس کر
قول کا پاس نہ کچھ خوفِ خدا کرتے ہو

آپ کی ساری خدائی ہے مرے ہی دم تک
اپنی دنیا کو مٹاتے ہو یہ کیا کرتے ہو

اب وہ ہر دم دلِ بیکس پہ نظر رکھتے ہیں
میرے نالے بھی قیامت کا اثر رکھتے ہیں



اَب وہ ہر دم دِلِ بے کس پہ نظر رکھتے ہیں
میرے نالے بھی قیامت کا اثر رکھتے ہیں

ہیں ستائے ہوئے ہم لاکھ زمانے کے تو کیا
اپنی غربت میں بھی اِک شان مگر رکھتے ہیں

اُنہی پر برق گری جا کے ترے جلوؤں کی
جن کو دعویٰ تھا کہ ہم تابِ نظر رکھتے ہیں

کچھ سمجھ کر ہی میں بھٹکا ہوں رہِ الفت میں
ورنہ دیوانے بھی منزل کی خبر رکھتے ہیں

تاڑ لیتے ہیں نگاہوں سے مرے شوق کو وہ
حُسن والے بھی قیامت کی نظر رکھتے ہیں

نازِ بے جا ہے ستم ڈھانے پہ بندہ پرور
صدمے سہ جائے جو ہم بھی وہ جگر رکھتے ہیں
اِس لگاوٹ کے میں صدقے کہ وہ اب ای یجیئی آہے
مُجھ سے چُھپ کر میری حالت کی خبر رکھتے ہیں

ذرا بڑھنے تو دو دردِ نہاں آہستہ آہستہ
بدل دوں گا یہ تنظیمِ جہاں آہستہ آہستہ

یقیں ہے مجھ کو اِک دن میری اُلفت رنگ لائے گی
اثر دِکھلائے گی دِل کی فغاں آہستہ آہستہ

مِلا کر مُجھ سے نظریں، مُسکرا کر چل دیئے تم تو
یہاں بڑھتا گیا دردِ نہاں آہستہ آہستہ

ڈِھل جاتا ہے دِل صیّاد کا بھی اب تو اے یحییٰ
مجھے آ ہی گئی طرزِ فغاں آہستہ آہستہ

زمانے کی زد سے نکلنا ہے مشکل
نگاہوں سے گر کر سنبھلنا ہے مشکل

میں ناداں نہیں جو کروں شکوۂ غم
وضع کا مری اَب بدلنا ہے مشکل

تمہیں رازِ الفت سناؤں تو کیوں کر
بیاں میں زباں کا سنبھلنا ہے مشکل

محبّت کا انجام مانا کہ غم ہے
اَب اس کو خوشی سے بدلنا ہے مشکل

یہ عالم ہے اب ناتوانی کا یحییٰ
شبِ غم میں کروٹ بدلنا ہے مشکل

قیدیٔ زلفِ سیہ فام ہوئے
مرکزِ گردشِ ایّام ہوئے

دل لگاتے نہ یہ طعنے سہتے
مفت میں موردِ الزام ہوئے

گر خزاں رہتی تو رہتے پامال
فصلِ گل آئی تو بدنام ہوئے

اور ہوں گے جو مٹے خلوت میں
ہم تو پامال سرِ عام ہوئے

کیا برا حال ہے ان کا یکتیؔ
اپنی الفت میں جو بدنام ہوئے

بیٹھے بیٹھے یادِ کس کی آگئی
پھر غموں کی دِل پہ بَدلی چھاگئی

دل کی دنیا میں اندھیرا چھا گیا
یاس جب امید سے ٹکرا گئی

تا اَبد ہو ناز جس پر زیست کو
وہ محبت کی گھڑی بھی آگئی

ہم سے مر کر بھی نہ آیا انقلاب
تم نے جب چاہا قیامت آگئی

اللہ اللہ حُسن کی آرائشیں
اِک قیامت پر قیامت آگئی

رحم کر یحییٰؔ کے حالِ زار پر
بے کسی سے زندگی گھبرا گئی

ناتوانی کا یہ عالم ہے کہ بس کیا کہئے
شکریہ تک بھی ادا ہو نہ سکا پرسِش کا

تیری چتون سے ہوا جاتا ہے سب راز افشا
بھید اب چھُپ نہیں سکتا ہے تری سازِش کا

ہے خطاؤں سے ہوا شانِ کریمی تیری
بندۂ درد ہوں خواہاں ہوں تری بخشش کا

میری تقدیر میں لکھے ہیں خدا نے آنسو
تم نے پایا ہے مُقدّر سے مزاج آتش کا

داغ وہ تم نے دیا ہے کہ دِکھا بھی نہ سکوں
آگ وہ تم نے لگائی کہ بُجھا بھی نہ سکوں

ناتوانی کا بُرا ہو کہ کیا خانہ خراب
حالِ دِل چاہوں سُنانا تو سنا بھی نہ سکوں

رنگ لائی ہے یہ بدبختئِ قسمت میری
درد سہہ بھی نہ سکوں، تم کو دِکھا بھی نہ سکوں

راز جینے کا مِری وہ ہے کہ خود تم کو بھی
میں اگر چاہوں بتانا تو بتا بھی نہ سکوں

جبر کا اُن کے ہے منشا یہی یحییٰ یعنی
اپنی بِگڑی ہوئی تقدیر بنا بھی نہ سکوں

وہ برہمی نہ رہی اب وہ بے رُخی نہ رہی
مزہ تھا جس سے طلب کا وہ بات ہی نہ رہی

میں تیرے جبر کے صدقے نہ کر ملال اِس کا
غم و اَلم کی دِلِ زار کو کمی نہ رہی

اُلٹ کے رکھدئے فکرِ رسا نے سب پردے
نگاہِ دِل سے حقیقت کوئی چھُپی نہ رہی

وہی ہوں میں بھی وہی دِل کی آرزو لیکن
ترے بغیر بہاروں میں دلکشی نہ رہی

دِلِ تباہ سے طوفانِ غم نہیں اُٹھتا
تری نگاہ میں پہلی سی بات ہی نہ رہی

وہ بے نقاب جو محفل میں آئے تو اُس دم
خبر کسی کو بھی پھر اپنے ہوش کی نہ رہی

نہ موت آتی ہے غم سے نہ زندگی کی سبیل
کروں تو کیا کروں جب بس کی بات ہی نہ رہی

وہ سامنے بھی جو آئے تو کیا ہو آسکی آہ
نگاہِ شوق کو جب تابِ دید ہی نہ رہی

ہے دِل میں دَرد مگر لب پہ میری آہ نہیں
تباہ ہو کے بھی حالت مِری تباہ نہیں

اسی سے راز کُھلا کرتے ہیں حقیقت کے
یہ رسم و راہِ محبت کوئی گناہ نہیں

نگاہِ شوخ نے شاید اُسے بھی توڑ دیا
شکستِ شیشۂ دل کی صدا ہے آہ نہیں

خفا ہیں وہ بھی زمانہ بھی مجھ سے برگشتہ
کہیں بھی غمزدہ دِل کے لئے پناہ نہیں

پرکھ سکے جو محبّت کو ہر طرح سچی آہ
یسّر ایسی ہر اِک شخص کو نگاہ نہیں

تری بدمست نظروں کو بس اتنا کام کرنا تھا
کہ میری مے کشی کو بے نیازِ جام کرنا تھا



مجھے بدنام ہو کر ہی تمہارا نام کرنا تھا
کہ پیدا عشق کے آغاز سے انجام کرنا تھا

تری بدمست نظروں کو بس اتنا کام کرنا تھا
کہ میری مے کشی کو بے نیازِ جام کرنا تھا

سُنا ہی غیر سے میں نے کہ تم ناراض ہو مجھ سے
بھلا مجھ سے ہی کہہ لیتے نہ یوں بدنام کرنا تھا

خوشامد سے نہ تھا ممکن تو جالِ دیگر سہی یحییٰ
بہر صورت تجھے اُس بے وفا کو رام کرنا تھا

آخر نگاہِ حُسن ڈبو ہی گئی مجھے
میں زندگی کو ڈھونڈتا ہوں زندگی مجھے

اب تو ہی پردہ رکھ لے مِرا مرگِ ناگہاں
رُسوا کہیں نہ کر دے مِری زندگی مجھے

یوں کھو گیا ہوں پا کے تجھے راہِ عشق میں
ڈھونڈے گی حشر میں بھی مِری زندگی مجھے

تم اور تمہارا درد و غمِ جاوِداں مِلے
سب کچھ مِلا مگر نہ ملی زندگی مجھے

مجھ کو ملا بہار میں جب موت کا پیام
حسرت سے دیکھتی تھی مِری زندگی مجھے

سمجھانے پر بھی اب تو سنبھلتا نہیں ہے دل
تیرے بغیر بار ہے اب زندگی مجھے

رکھنے کو لاج دردِ وفا کی جہان میں
یکجی آ نثار کرنا پڑی زندگی مجھے

ابھی یہ عجز پر مائل نہیں ہے | ابھی دل آپ کے قابل نہیں ہے

بھٹکتا پھر رہا ہوں راہِ غم میں | مری تقدیر میں منزل نہیں ہے

وہی میں ہوں، وہی میری تمنّا | مگر وہ زینتِ محفل نہیں ہے

نہ کر اَب یاد وہ گزرا زمانہ | کہ پچھتانے سے کچھ حاصل نہیں ہے

بناؤں غیر کو پھر کیسے اپنا | مرا دل بھی تو میرا دل نہیں ہے

حقارت سے نہ دیکھ اُس کو کہ یحییٰ
ترا شیدا ہے وہ سائل نہیں ہے

ہوں خوشی کے تو ناز ہیں آنسو
غم کے ہوں تو نیاز ہیں آنسو

موت سے بھی نہ ہو سکا جو فاش
زندگی کا وہ راز ہیں آنسو

بے اثر یہ کبھی نہیں ہوتے
دِل کا سوز و گداز ہیں آنسو

صدمے مِضرابِ غم ہیں اے تحسینؔ
درد نغمہ ہے ساز ہیں آنسو

بیکسی کا مری رکھ لیجیو پردا صیّاد
تیرے صدقے مجھے آزاد نہ کرنا صیّاد

مٹ کے ہیں ہو چکا آزاد غموں سے کب کا
تیرا پیغام بہت دیر میں پہنچا صیّاد

ہم نے مٹ کر بھی ترے جور کا شکوہ نہ کیا
کون اس طرح ترے ناز اُٹھاتا صیّاد

مجھ کو آتا ہے رہِ عشق میں مٹ کر بننا
ڈھونڈ اب اور مٹانے کا بہانا صیّاد

آگیا نغمۂ درد آج لبِ بیکسیؔ پر
پھر پلٹنے کو ہے تقدیرِ زمانا صیّاد

جھوم کر جب کبھی گھنگور گھٹا چھاتی ہے
اُس گھڑی دِل کی ہر اک چوٹ ابھر آتی ہے

بن گئی اب تو فسانہ ترے ملنے کی بات
زندگی دیکھئے پھر کب اِسے دُھراتی ہے

ضبط کرتا ہوں مگر جوش کا یہ عالم ہے
دِل کی ہر بات مرے لب پہ کھِچی آتی ہے

دِل کو سمجھاتا ہوں فرقت میں یہی کہہ کہہ کر
اب صبا آتی ہے اب اُن کی خبر لاتی ہے

اب تو غم میں بھی نہیں ملتی ہے لذّت اَے دوست
جانے کیوں زندگی بے لطف ہوئی جاتی ہے

بدگمانی کا ہے ڈر کیسے سُناؤں کیفیؔ
بات دِل کی مرے دل ہی میں رہ جاتی ہے

جلوؤں نے لُوٹ لی طاقت مری گویائی کی
کیسے تعریف کروں اَب تری رعنائی کی

اُس نے چاہا تھا تڑپتا ہی رہوں فرقت میں
سحر ہو ہی گئی آخر شبِ تنہائی کی

نہ ہوا پَر نہ ہوا غم کا مَداوا ممکن
دل کی دِل ہی میں رہی تیرے تمنّائی کی

درد بڑھتا گیا گھٹ گھٹ کے تری فرقت میں
عمر گھٹتی گئی میری شبِ تنہائی کی

میں نے کھل کر غمِ فرقت کے مضامیں باندھے
بات جب آ پڑی تھی شبِ تنہائی کی

اُن کا کہنا ہے محبّت میں زباں اچّھا ہے
گنگ ہو جائے جو اَب میری زباں اچّھا ہے

نیچی نظروں ہی سے کہہ جاتے ہیں وہ دل کی بات
اُن کی آنکھوں کا یہ اندازِ بیاں اچّھا ہے

مُطمئن کر نہ سکے جو مِرے ٹوٹے دِل کو
اُس یقیں سے تو مِرا وَہم و گماں اچّھا ہے

بے زبانی ہی زباں ہوتی ہے درد و غم کی
اُن پہ ہو جائے جو یہ راز عیاں اچّھا ہے

جب تو کچھ بھی نہ تھا قسمت میں پَر اَب خار تو ہیں
اُن بہاروں سے تو یہ دَورِ خزاں اچّھا ہے

تم جو ہو جاؤ مِرے پھر تو یقیں آ جائے
لوگ کہتے ہیں کہ یہ دَورِ جہاں اچّھا ہے

اِنقلاب آئے زمانے میں نہ جس سے کوئی
ایسی بیداری سے تو خوابِ گراں اچھا ہے

وضعداریٔ مُحبّت کی قسم اَے یحییٰؔ
غم کے اِظہار سے تو دَردِ نہاں اچّھا ہے

حاصلِ زندگی تھی بس وہ شب
جو ترے انتظار میں گذری



زندگی یادِ یار میں گذری — حسرتوں کے شمار میں گذری

حاصلِ زندگی تھی بس وہ شب — جو ترے انتظار میں گذری

کی وفا عمر بھر نہ قسمت نے — زندگی انتظار میں گذری

اِک جوانی خزاں نصیب رہی — اِک جوانی بہار میں گذری

مجھ کو اُس زندگی کا شکوہ ہے — جو ترے اختیار میں گذری

زندگیٔ عزیز اے یحییٰ
جستجوئے قرار میں گذری

زندگی کو نہ اگر تیرا سہارا ہوتا
پھر تو مٹنے کے سوا کوئی نہ چارا ہوتا

کاش ہو سکتا مجسّم تری صورت کا خیال
پھر تو بے قیدِ نظر تیرا نظارا ہوتا

ہم ہی تھے حُسن کی قسمت میں ازل سے شامل
ہم نہ ہوتے تو بھلا کون تمہارا ہوتا

کاش ہوتا اُنھیں کچھ پاس مرے مٹنے کا
پھر تو ہر غم مجھے دنیا کا گوارا ہوتا

درد ہوتا نہ اگر اپنا ہی درمانِ یحییٰ
زندہ رہنا مجھے ہرگز نہ گوارا ہوتا

جوش پر پھر ہے طبیعت ترے دیوانوں کی
پھر چمکنے کو ہے تقدیر بیابانوں کی

ٹوٹا ٹوٹا سا ہے ہر ایک سہارا دِل کا
سُونی سُونی سی ہے دنیا مرے ارمانوں کی

غم دیا سوز دِیا اِس پہ بھی دِل توڑ دیا
کچھ نہایت ہی نہیں آپ کے احسانوں کی

ساری دنیا تو چھٹی تم نے بھی مُنہ موڑ لیا
قابلِ رحم ہے حالت مرے اَرمانوں کی

اور ہی رُخ ہے ہوائے غمِ دِل کا بیکسؔ
بہکی بہکی سی ہیں باتیں ترے دیوانوں کی

نہ غم ہی راس آتا ہے، نہ لذّت ہے مسرّت میں
اضافہ ہو رہا ہے دن بدن میری مصیبت میں

اُنہی پر جان بھی دیجے مٹاتے ہیں جو اپنوں کو
نرالا یہ بھی اک دستور دیکھا ہے محبّت میں

جدائی کی گھڑی اور اُس پہ اُن کی آنکھ میں آنسو
نیا اک اور منظر تھا قیامت کا قیامت میں

نہ جانے کب بنائے گی تری مرضی مری قسمت
سہارا ڈھونڈتا کب تک رہوں گا تیری فرقت میں

غبارِ کارواں کو جس طرح منزل نہیں ملتی
رہے گی کیا یوں ہی تیری جدائی میری قسمت میں

مجھے مرنا پڑے گا زندگی کے واسطے یحییٰ
کہ اب دشوار ہے جینا مرا حسرت ہی حسرت میں

ہوا نصیب ہے یوں وصلِ یار کیا کہنا
شرابِ ناب و لبِ جوئے بار کیا کہنا

کسر اُٹھا نہ رکھیں آج عیش و عشرت میں
بہار اور پھر ایسی بہار کیا کہنا

فقط ہمیں نہیں تنہا اسیرِ حُسن و جمال
ہیں وہ بھی طالبِ دیدارِ یار کیا کہنا

ابھی ہے ابتدا ہی سخنوری کی مگر
غزل ہے آپ کی یہ شاہکار کیا کہنا

جانِ سکون آبھی جا، تیرا ہی اِنتظار ہے

آنکھوں سے اشک ہیں رواں جان بھی بیقرار ہے

ہونے کو فصلِ گل بھی ہے، دعوتِ عیش بھی مگر

اپنی بہار کا مجھے آج بھی اِنتظار ہے

سارے سہارے عِشق کے ٹوٹ چکے ہیں ہجر میں

ایک تمہاری یاد بس درد کی غم گسار ہے

عہدِ وفا کا آپ کے، لطف و کرم کا آپ کے

اور کسی کو ہو نہ ہو مجھ کو تو اعتبار ہے

دیکھ تو آ کے ہجر میں کتنا ہے گہرا رنگِ یاس

مجھ کو اُداس دیکھ کر درد بھی سوگوار ہے

لُٹ چکی غم کی آبرو مٹ چکی دل کی آرزو

پھر بھی اُمیدوار ہے یکجئی نگاہِ لطف کا

ساری دنیا سے جو بیزار نظر آتا ہے
تیرا دیوانہ تو ہشیار نظر آتا ہے

جب نہیں پاتا ہوں صورت تری اہیں اے دوست
ہر نظارا مجھے بیکار نظر آتا ہے

ڈگمگاتے ہیں قدم میرے رہِ الفت میں
اَب سنبھالنا مِرا دشوار نظر آتا ہے

جو گذرتی ہے میں وہ کہہ نہیں سکتا اُن سے
رازِ ناقابلِ اظہار نظر آتا ہے

عرضِ غم کرنے کو تیّار ہوں میں بھی لیکن
اُن کی آنکھوں میں بھی اِصرار نظر آتا ہے

دیکھ دنیائے وفا عشق کی برباد نہ ہو
اِتنا مایوسِ کرم اے دِلِ ناشاد نہ ہو

کسی پہلو بھی نہیں چین میسّر دِل کو
کوئی شب ایسی نہیں جس میں تری یاد نہ ہو

دِل میں تو درد قیامت کا اُٹھا ہے لیکن
پھر بھی چُپ ہوں کہیں رُسوائیِ فریاد نہ ہو

میں ہوں مٹ جانے پہ، بیداد پہ تم آمادہ
دیکھو اب دہر میں رُسوائیِ بیداد نہ ہو

شعر ممکن نہیں کہہ جانا روانی کے ساتھ
دل میں کچھ بھی جو اگر دردِ خداداد نہ ہو

شامِ غم کی سحر نہیں ہوتی
زندگی مختصر نہیں ہوتی

کوئی امید گر نہیں ہوتی
زندگی بھی بسر نہیں ہوتی

عرضِ غم پر بہوئے ہو کیوں برہم
یہ خطا جان کر نہیں ہوتی

جو نکلتی ہے دل سے اے یحییٰ
وہ صدا بے اثر نہیں ہوتی

جب خود کو ہم مٹانے پہ مجبور ہو گئے
وہ اور اپنے حسن پہ مغرور ہو گئے

اب پختگیٔ عشق کا ملتا ہے کچھ پتہ
وہ بے نیاز رہنے پہ مجبور ہو گئے

اب کیا کروں میں ان کا مداوا تو ہی بتا
رِس رِس کے زخمِ دِل کے تو ناسور ہو گئے

فرمان جو دئے گئے اُس چشمِ مست سے
دنیائے عشق کے وہی دستور ہو گئے

کچھ اُن کے دِل سے پوچھئے مجبوریٔ وفا
جو یاد کر کے آپ کو مسرور ہو گئے

یہ حُسنِ رہِ شوق ہیں کچھ اس طرح مٹا
کہ وہ بھی رحم کرنے پہ مجبور ہو گئے

طاریِ اب عالمِ حسرت وہ کہاں ہے، دل پر
کِس لئے تیری نظر اب نگراں ہے، دِل پر

اب نہ گھبراؤں گا انجامِ وفا سے ہرگز
اب تو ہر رازِ محبّت کا عیاں ہے دِل پر

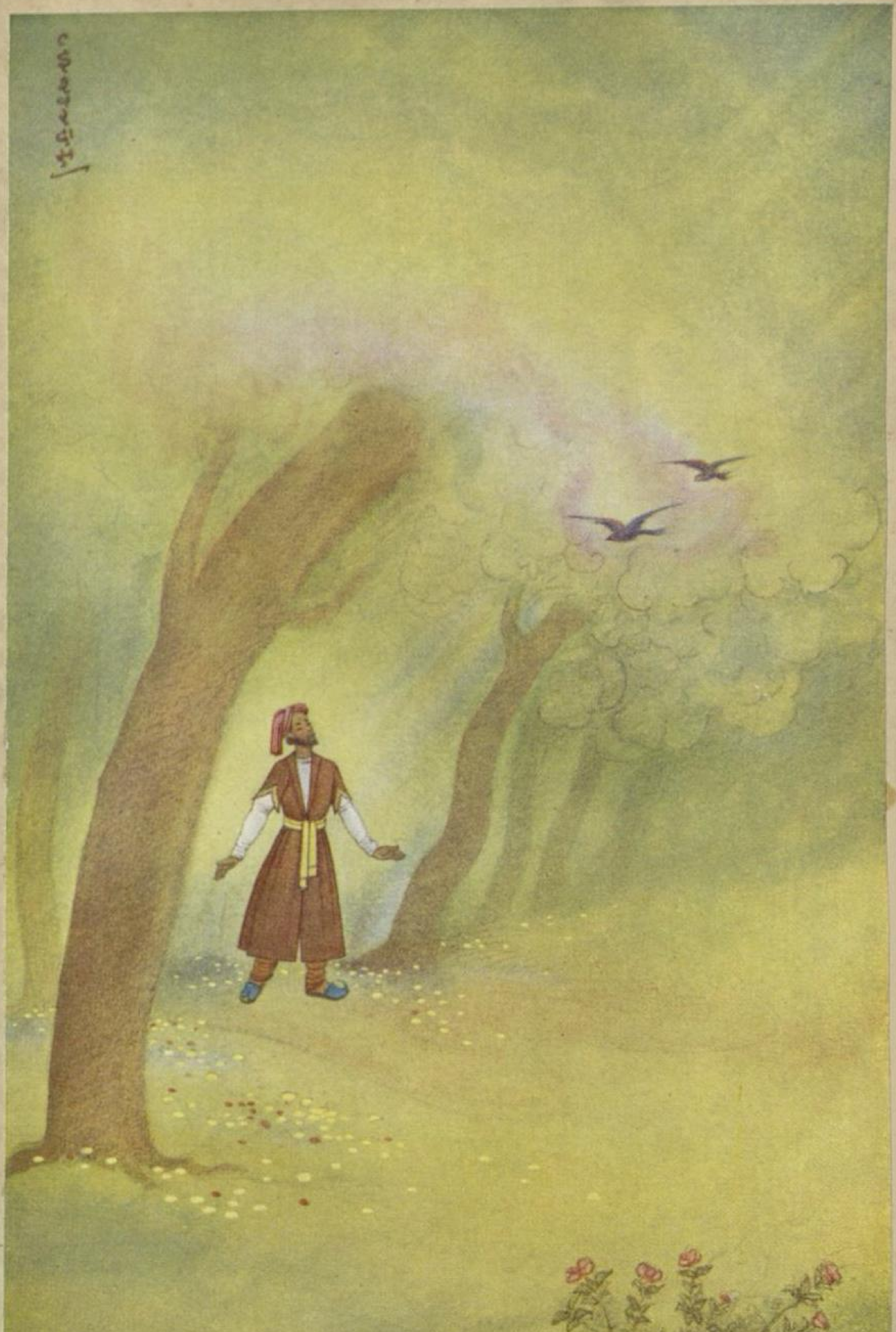
یوں تو غم اور بھی جھیلے ہیں رہِ ہستی میں
جانے یہ کونسا غم ہے جو گراں ہے دل پر

بھول جاؤں میں تمھیں تارکِ دُنیا ہو کر
اختیار اتنا مگر آج کہاں ہے دل پر

جانے کیا بات ہی جو دِل نہیں ہوتا مسرور
آپ ہیں پاس مگر چھائی خزاں ہے، دِل پر

ناز تھا جس پہ کبھی دردِ وفا کو یحییٰ
وہ عنایت کی نظر آج کہاں ہے دِل پر

سب کو خوشی بہار کی ہے اور میں یہاں
اپنی بہار ڈھونڈ رہا ہوں بہار میں



لذّت سی پا رہا ہوں عجب اِنتظار میں
شاید کہ خونِ دِل بھی ہے شاملِ بہار میں

تھے زندگی میں، اپنی وہی زندگی کے دن
ہم نے بسر کئے جو ترے انتظار میں

نظریں دوچار ہوتے ہی کچھ بھی نہ بن پڑا
کیا کیا تھے ولولے دِلِ حسرت شعار میں

تم نے کرم سے اپنے اُسے کر دیا نہال
ورنہ غریب دِل تھا بھلا کِس شمار میں

آنا ہے تو اب آؤ کہ ہے زندگی اُداس
بے کیف کٹ رہے ہیں مِری دن بہار میں

سب کو خوشی بہار کی ہے اور میں یہاں
اپنی بہار ڈھونڈ رہا ہوں بہار میں
یحییٰ شکایتِ غمِ دوراں فضول ہے
کیا دخل ہے مشیّتِ پروردگار میں

ہم سے مِٹ کر بھی نہ دَورِ غم کو بدلا جائے ہے

وہ جہاں چاہیں قیامت بھی وہیں آ جائے ہے

عہد و پیماں پر ترے پھر حرف آیا جائے ہے

دیکھ چشمِ منتظر سے خون ٹپکا جائے ہے

اُف قیامت حسن اُس پہ پے بہ پے انگڑائیاں

کون دیکھے، یہ نظارا کس سے دیکھا جائے ہے

وہ جو دیکھے دل کی دھڑکن اور ہو جاتی ہے تیز

میں جو دیکھوں، اور بھی وہ مجھ سے شرما جائے ہے

اب کہاں بے کس کا دنیا میں کوئی پرسانِ حال

وہ جو رُوٹھے ہیں زمانہ مجھ سے رُوٹھا جائے ہے

جیسے جیسے ٹوٹتی جاتی ہیں امیدیں مری
ویسے ویسے رازِ ہستی مجھ پہ کھلتا جائے ہے

ہم وفائیں کرتے کرتے عاشقی میں مٹ گئے
اور وہاں ذکرِ وفا تک بھی نہ چھیڑا جائے ہے

اُن سے اتنے بےحسی امیدِ لطف اب میں کیا رکھوں
جب وہاں عرضِ وفا پر مسکرایا جائے ہے

با اثر درد کی دعا نہ ہوئی
غم سے ہستی مری رہا نہ ہوئی

کھو دئے اِک نظر میں صبر و قرار
اِک قیامت ہوئی ادا نہ ہوئی

غم کے طوفاں اُٹھے مگر تیری
یاد دل سے کبھی جُدا نہ ہوئی

یوں تو سب کچھ ہی وہ نظر لیکن
درد دِل کی مرے دوا نہ ہوئی

وہ بھی آمادۂ عنایت تھے
پھر بھی تسکینِ دِل ذرا نہ ہوئی

زِندگی، زِندگی نہیں کچھ بھی
جو مُحبّت سے آشنا نہ ہوئی

اثر دکھا ہی گئی آہِ بے اثر میری
نگاہِ ناز کو لینا پڑی خبر میری

کچھ ایسا کھویا گیا ہوں رہِ محبّت میں
کہ اب تو مجھ کو بھی ملتی نہیں خبر میری

پیامِ دل ترے دل تک میں کیسے پہنچاتا
زباں کا کام نہ کرتی اگر نظر میری

سُنا سکوں گا میں اُس کو نہ سن سکے گا کوئی
رہی جو حالتِ دل شام تا سحر میری

اب اُن کو پاؤں تو کس طرح پاؤں اے آسیؔ
جہاں ہیں وہ وہاں ممکن نہیں گذر میری

خونِ حسرت سے ہے رنگین حکایت میری
قابلِ رشک ہے اے دوست محبت میری

منزلِ ترکِ تمنّا پہ تو میں آپہنچا
دیکھئے اب کہاں لے جاتی ہے وحشت میری

مجھ کو تو تیری تمنا میں بسر کرنی ہے
میں نے مانا کہ نہیں تجھ کو ضرورت میری

میرے ہی دم سے ہے وابستہ محبّت کی بہار
تو نے سمجھی نہیں اے دوست حقیقت میری

اب سہے جاتے نہیں مجھ سے جدائی کے ستم
اب تو للہ بدل دیجئے قسمت میری

اِک نظر دیکھتے ہی ہوش وخرد کھو بیٹھا
لے نہ ڈوبے کہیں یہی آہ مجھے حیرت میری

دل کی لگی کو اور وہ بھڑکا رہی ہیں آج

سرتا بہ پا بہار بنے جا رہے ہیں آج

جیسے کہ ہو رہا ہو طلوعِ آفتابِ ناز

کچھ ایسی شان سے وہ چلے آ رہے ہیں آج

یہ حُسنِ بے نیاز، یہ آرائشِ جمال

پھولوں کے بھی شباب کو شرما رہے ہیں آج

ٹھکرا کے اِلتجاؤں کو پائے غرور سے

ارمانوں کا وہ خون کئے جا رہے ہیں آج

وہ پیار کی فضائیں، وہ رنگین صحبتیں

منظر وہ سارے شوق کے یاد آ رہے ہیں آج

یحییٰ آسی گِلہ کریں بھی تو کِس بات کا کریں
اپنے کئے کی آپ سزا پا رہے ہیں آج

زندگی میری مٹے گی مجھے معلوم نہ تھا
کوئی غم کا نہیں ساتھی مجھے معلوم نہ تھا

چُھپ چھپا کر میں تو کوچے سے گذر ہی جاتا
جستجو اُن کو تھی میری مجھے معلوم نہ تھا

کیا خبر تھی کہ وہ ہنس دیں گے مِری حالت پر
دِل پہ پھر چوٹ لگے گی مجھے معلوم نہ تھا

لاج رکھنی تھی مجھے مٹ کے وفاداری کی
پھر بھی قِسمت نہ پھرے گی مجھے معلوم نہ تھا

خاک میں مل گئے سب اشکِ محبت افسوس
آتشِ دل نہ بجھے گی مجھے معلوم نہ تھا

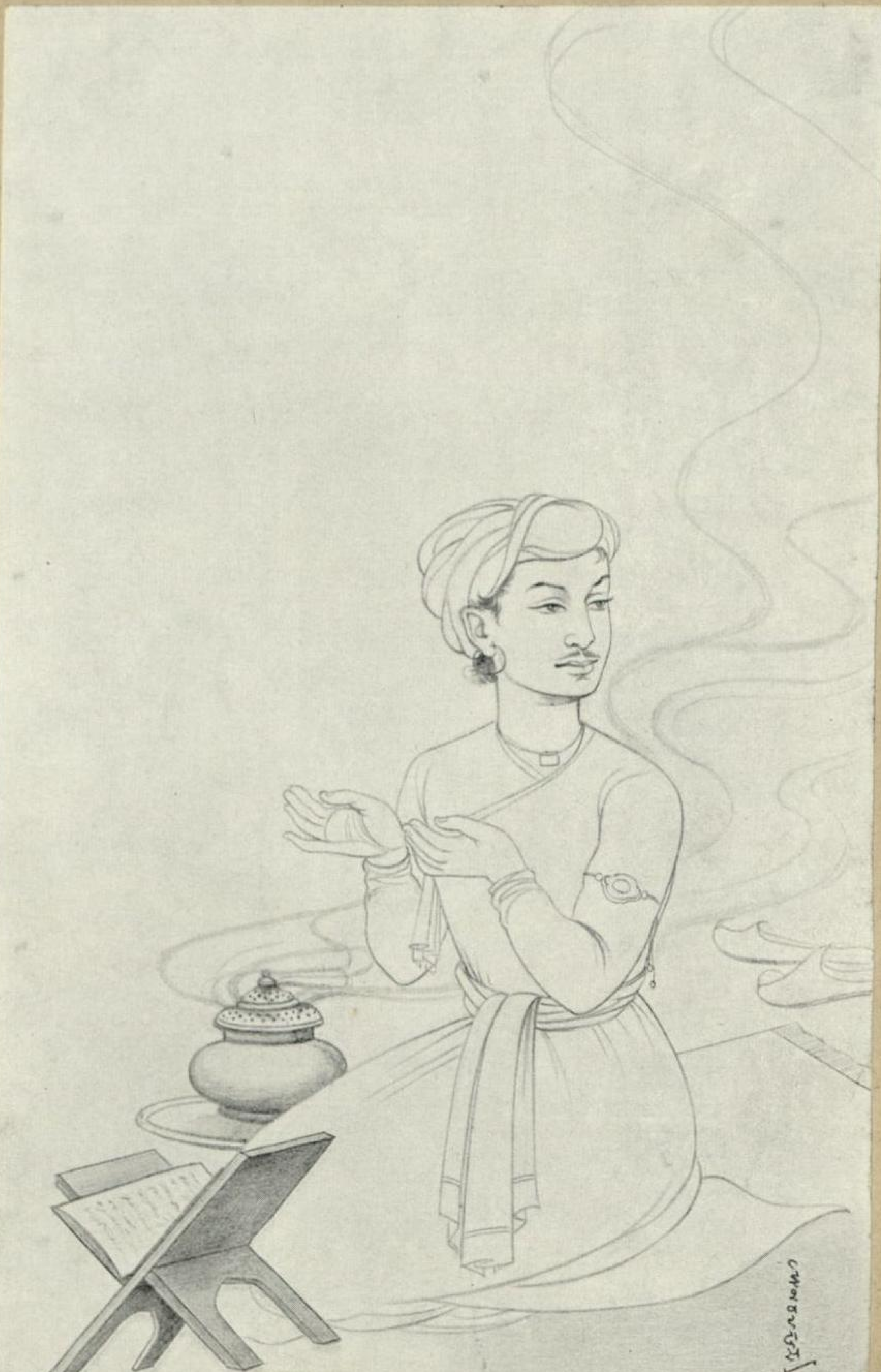
رازِ بے تابیٔ دل کر دیا اُن پر ظاہر
بات یہ کہنی نہیں تھی مجھے معلوم نہ تھا

ترے دیدار کی تھی دل کو تمنّا لیکن
یادِ تر ساتی رہے گی مجھے معلوم نہ تھا

میں تو سمجھا تھا کہ مٹ کر انھیں اپنا لوں گا
بات پھر بھی نہ بنے گی مجھے معلوم نہ تھا

عمر گذرے گی بس اُمّیدِ کرم میں یحییٰ
آرزو ہوگی نہ پوری مجھے معلوم نہ تھا

ہائے کیا چیز ہے مجبوریِٔ الفت یحییٰؔ
جب وہ یاد آئے تو ہم یادِ خدا بھول گئے



کی خطا شیوۂ تسلیم و رضا بھول گئے
ہائے تقدیر کہ قسمت کا لکھا بھول گئے

عشق کی قسمتِ محروم الٰہی توبہ
یہ بھی اب یاد نہیں ہم کو کہ کیا بھول گئے

دِل تو معمورِ شکایت تھا مگر کیا کہیے
سامنا ہوتے ہی ہم شکوہ گلہ بھُول گئے

حسرت و یاس نے رکھا نہ کہیں کا ہم کو
تیری فرقت میں تڑپنے کا مزہ بھُول گئے

ہائے کیا چیز ہے مجبوریٔ الفت یحیٰیؔ
جب وہ یاد آئے تو ہم یادِ خدا بھُول گئے

جی سے گذر نہ جائیں تو ناچار کیا کریں
تو ہی بتا کہ غم کے گرفتار کیا کریں

جاں دے کے ہم نے غم کا مداوا تو کر لیا
لیکن علاجِ نرگسِ بیمار کیا کریں

مشکل تھا پہلے جینا ہی تیرے فراق میں
مرنا بھی اب تو ہو گیا دشوار کیا کریں

احساس اب خوشی کا ہے باقی نہ رنج کا
یہ دَورِ زندگانی ہے بیکار کیا کریں

مَے پی کے رند ہوش میں آتے تو ہیں کبھی
لیکن نگاہِ مست کے سرشار کیا کریں

جب خود پلا رہا ہے ہمیں ساقیِ ازل
پھر ہم شرابِ عشق سے انکار کیا کریں

ہم بیکسوں پہ نیند بھی اب ہو گئی حرام
رکھتی ہے یاد راتوں کو بیدار کیا کریں

دَم کھنچ کے لب پہ آگیا ہے یاد میں حضورؐ
بتلائیے کہ طالبِ دیدار کیا کریں

جب ہر نگاہ دردِ ہو پیچیِ پیامِ شوق
پھر آرزوئے عشق کا اظہار کیا کریں

سکوں کے ساتھ وابستہ وہاں پہ ہے قیامت بھی
کہ اُن کی پیاری آنکھوں میں حیا بھی ہے شرارت بھی

نہیں آتے جو پہلو میں تصور ہی میں آجاؤ
بہار آئی ہے، خلوت بھی ہے، نکلے دل کی حسرت بھی

ستم گر یاد آئیں گے تمہارے دردمندوں کو
نہ بھولے گا زمانہ حشر تک میری محبّت بھی

بہت ہی پرخطر ہے جستجو کی راہ اے ناداں
کہ راہِ عشق میں اے دل مصیبت بھی ہے عشرت بھی

بہت کچھ اور کہنا ہے دیا گر زیست نے موقع
تخیّل میں ہے وسعت اور زباں میں میری طاقت بھی

مجھے اپنی تباہی کا نہیں شکوہ مگر یہ بھی
انھیں بھی کر دیا رسوا قیامت ہے محبّت بھی

اک دل ادا شناسِ زمانہ بھی ہے یہی
پامال حسرتوں کا ٹھکانا بھی ہے یہی

آرام گاہِ دِل کو سمجھنا نہ دردِ عشق
تیرِ ستم کا اُن کے نشانہ بھی ہے یہی

رُودادِ کامیابی وہ سمجھے ہیں جس کو آہ
میری تباہیوں کا فسانہ بھی ہے یہی

ننگِ نیازِ عشق ہے یہ التجائے درد
لطف و کرم کا اُن کے بہانہ بھی ہے یہی

طرزِ کلام تیرا نئے ہے قبولِ غم
خوش قسمتی سے رنگِ زمانہ بھی ہے یہی

ترا جلوا کیوں آج ہر سُو نہیں ہے
ہے نظارہ بے کار جو تو نہیں ہے

سکوں مل نہیں سکتا دِل کو جہاں میں
مِرا شاملِ حال گر تو نہیں ہے

تِرے دم سے تھی فصلِ گل بھی مگر اَب
وہ پھولوں میں پہلی سی خوشبو نہیں ہے

دکھے دِل کو میرے تسلّی ہو کیوں کر
تصور میں تیری سی خو بو نہیں ہے

ہے آوارہ حسرت، پریشاں تمنّا
مکیں جب سے دِل میں مرے تو نہیں ہے

تمنّا بہاروں کی کیوں کر ہو مجھ کو
کہ پہلوئے اُلفت میں جب تو نہیں ہے

گئے جب سے تجھی آ وہ پہلو سے اُٹھ کر
طبیعت مری جب سے یکسو نہیں ہے

عجیب چیز محبّت کا اعتبار بھی ہے
کہ تجھ سے شکوہ بھی ہے تیرا انتظار بھی ہے

یہی کہ تجھ کو تمنّائے دیدِ یار بھی ہے
دل و نظر پہ تجھے اپنے اختیار بھی ہے؟

جہانِ شوق کی نیرنگیوں کا کیا کہنا
کہ صبحِ وصل بھی ہے شامِ انتظار بھی ہے

وہی کہ جس کو چھپانے پہ ناز تھا دل کو
وہ دردِ عشق نگاہوں سے آشکار بھی ہے

اب آبھی جاؤ تمہیں میری بے کسی کی قسم
کہ دورِ وصل بھی ہے، عالمِ بہار بھی ہے

ستم شعار سہی کیا کروں کہ وہ تجھی سے
نشاطِ روح بھی سرمایۂ قرار بھی ہے

جو تھا حقیر وہ دل آج سرفراز بھی ہے
کہ رشکِ ناز اب آمادۂ نیاز بھی ہے

سمجھ میں آئے تو کس طرح خامشی میری
کہ مختصر بھی ہے رُودادِ غم دراز بھی ہے

میں ڈر رہا تھا بہت پہلے یہ نہ تھا معلوم
کہ تیرا غم ہی ہر اک غم کا چارہ ساز بھی ہے

نہ کیوں ہو ناز مجھے قسمتِ محبّت پر
کہ تیرا غمزدہ ہر غم سے بے نیاز بھی ہے

عجیب چیز ہے ضدادا آرزو یحییٰ
طلب خوشی کی بھی اور غم سے ساز باز بھی ہے

نازواندازغضب اس پہ قیامت کا شباب
تم تو اِک حسن کی جاگیر لئے بیٹھے ہو



نیچی نظروں میں جو تاثیر لئے بیٹھے ہو
کس کے یہ خواب کی تعبیر لئے بیٹھے ہو

اب میں اس حُسنِ تکلّم کی کروں کیا تعبیر
تم تو خاموشی میں تقریر لئے بیٹھے ہو

ہو نہ جائے کہیں یہ پار کسی کے دل سے
اوٹ میں پلکوں کی جو تیر لئے بیٹھے ہو

ناز و انداز غضب، اس پہ قیامت کا شباب
تم تو اِک حسن کی جاگیر لئے بیٹھے ہو

دھیان کِس کا ہے یہ غم خانۂ دل میں بچھی آ
کِس ستمگر کی یہ تصویر لئے بیٹھے ہو

میں تصدّق تجھ پہ تو تو خود سراپا ناز ہے
ناز برداریٔ غم یہ کونسا انداز ہے

درد کی ہر بات ہے رازِ تمنّائے حیات
داستانِ درد ہی میں زندگی کا راز ہے

جس طرف اٹھتی ہیں نظریں جم کے رہ جاتی ہیں بس
یہ چمن شاید اسی کی جلوہ گاہِ ناز ہے

دل میں اک ہنگامۂ غم اور لب خاموش ہیں
زندگیِ عشق گویا سازِ بے آواز ہے

اب نبھے تو کس طرح نازو نیازِ عشق میں
میں سراپا درد و غم اور تو سراپا ناز ہے

قصۂ دردِ محبّت بھی عجب قصّہ ہے جو

ابتدا تا انتہا آغاز ہی آغاز ہے

میں بچا لیتا انھیں رُسوائی سے بچپن آئی مگر

کیا کروں پھر دل شکن وہ غمزۂ غمّاز ہے

کام کچھ بھی نہ دیا میری شکیبائی نے
لُوٹ لی تابِ نظر بھی تری رعنائی نے
سامنے آئے تھے ہر طرح کے جلوے لیکن
مُنہ بھی دیکھا نہ کسی کا ترے شیدائی نے
بن کے تم پردہ نشیں بچ گئے رُسوائی سے
وار پر وار ہمیں پر کئے رُسوائی نے
کبھی رونا کبھی ہنسنا، کبھی رہنا خاموش
رنگ کیا کیا نہ دکھائے شبِ تنہائی نے
ہچکیاں آتی ہیں کیوں آج مجھے آتے ہی
یاد مجھ کو نہ کیا ہو مری رُسوائی نے

جب سعیِ ضبطِ غم مِری ناکام ہو گئی
اُن کی جفا سکون کا پیغام ہو گئی

صبحِ اُمّید چھپ گئی انگڑائی سے تری
بکھری کچھ ایسی زلف کہ بس شام ہو گئی

مقصد نظر ملانے سے کچھ اور تھا مگر
تیری نظر تو موت کا پیغام ہو گئی

اب سوچتا ہوں درد میں کیوں مبتلا ہوا
میرے لئے تو زندگی اِلزام ہو گئی

یحییٰ ہو خیر زلف کی یہ ماجرا ہے کیا
اُس نے جہاں بھی چاہا وہیں شام ہو گئی

شکوہ زبانِ شوق پہ آیا نہیں ہنوز
دامن کو تیرے داغ لگایا نہیں ہنوز

جور و جفا کا مجھ پہ اثر ہو تو کِس طرح
دل نے ترے کرم کو بُھلایا نہیں ہنوز

بھولے سے میں نے اُن کو بُھلایا نہیں کبھی
اِس پر بھی اُن کو یاد میں آیا نہیں ہنوز

مُنہ سُرخ اُن کا ہو گیا ہوتے ہی سامنا
میں نے تو حالِ دِل بھی سُنایا نہیں ہنوز

بس جی رہا ہوں جینے کی تہمت لئے ہوئے
کوئی سہارا عشق نے پایا نہیں ہنوز

دیکھی کہاں ہے، آپ نے گلکاریٔ جنوں
پلکوں پہ دل کا خون تو آیا نہیں ہنوز

منہ میں زبان ہے، یہ مگر اور بات ہے
ذکرِ ستم لبوں پہ بھی لایا نہیں ہنوز

شرمندہ کیوں ہیں آپ جفاؤں پہ اِس قدر
میں نے کسی کو راز بتایا نہیں ہنوز

اَب بھی رُکا ہوا ہوں حدودِ نیاز میں
میں نے قدم کو آگے بڑھایا نہیں ہنوز

یحییٰ جو راز پہلے تھا اب بھی وہ راز ہے
نظروں نے دل کا حال سُنایا نہیں ہنوز

بے حجابانہ جو وہ حورِ شمائل آیا
پھر تو قابو میں دلِ زار بہ مشکل آیا

میں بھی آمادہ تھا کہنے کو وہ سننے کیلئے
حالِ دل لب پہ مرے پھر بھی بہ مشکل آیا

دل ہی قابو میں ہے میرے نہ زباں قابو میں
ہائے کس منہ سے کہوں تم پہ مرا دل آیا

کشتی جب میں نے ہی طوفاں کے حوالے کر دی
پھر کہیں جا کے سفینہ لبِ ساحل آیا

لطف اُن کا جو میسّر ہوا پھر تو یکجاؔ
مجھ کو ہر ذرّہ نظر پیار کے قابل آیا

ترا عہد او ستم گر، اگر استوار ہوتا
تو وفا کے روبرو پھر نہ میں شرمسار ہوتا

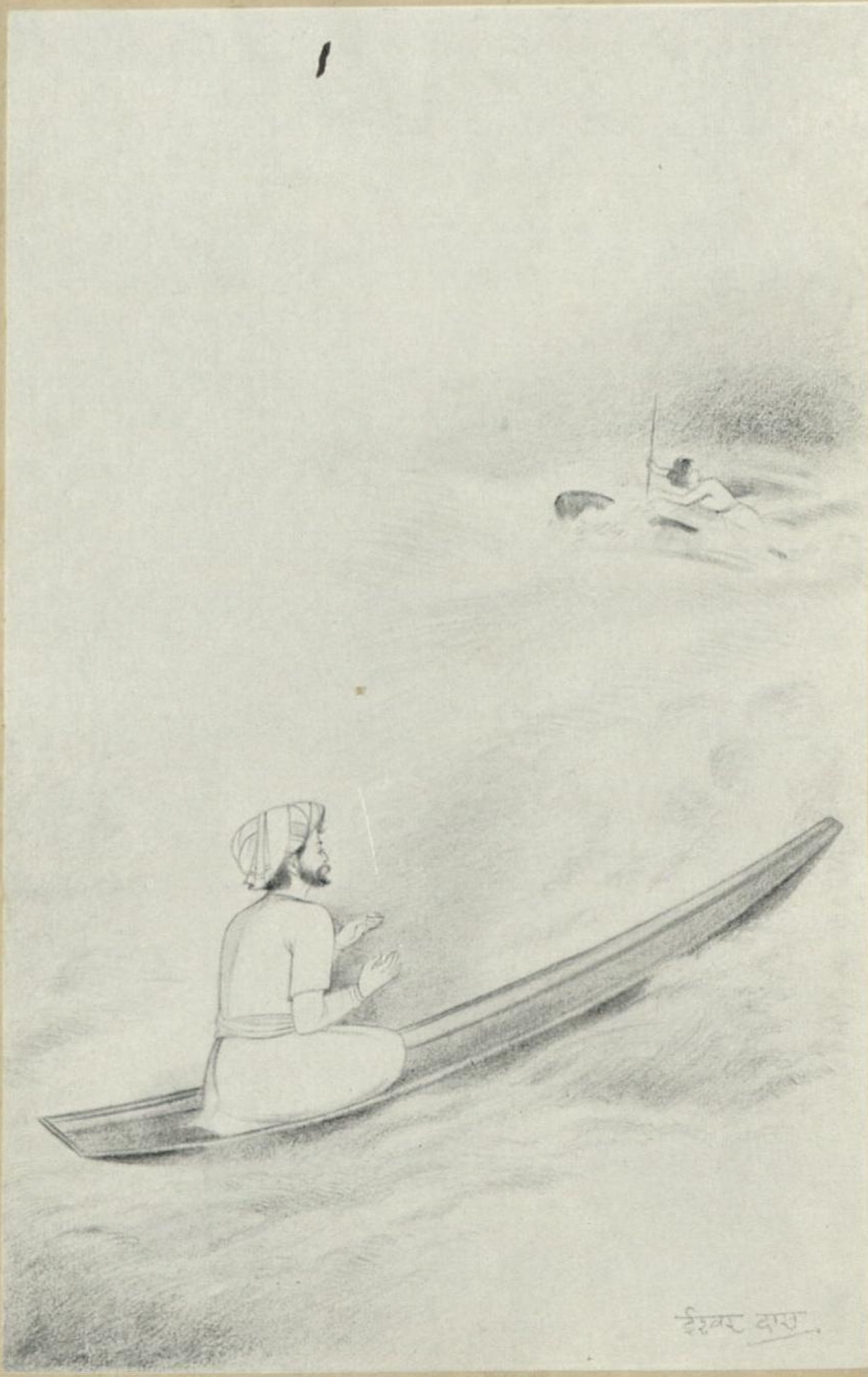
نہ کہیں کا مجھ کو رکھا تری ضد نے آہ اے دل
نہ تو بے قرار کرتا، نہ میں بے قرار ہوتا

نہ بہائے چشمِ حسرت اگر اشکِ آرزو کو
تو نگاہِ غم میں ہرگز نہ میں بے وقار ہوتا

یہی آرزوئے دِل تھی کہ بپاسِ خاطرِ غم
مِرے دردِ عاشقی کا کوئی رازدار ہوتا

نہ فریبِ عشق کھاتا، نہ کسی سے دِل لگاتا
مجھے اپنے دل پہ یحییٰ اگر اختیار ہوتا

ڈوبیں ہزاروں کشتیاں امید کی مگر
دریائے زندگی کا کنارا نہیں ملا


ईश्वर दास

اُس دل کا آسرا ہے فقط مرگِ ناگہاں

جس دِل کو زندگی کا سہارا نہیں مِلا

ڈوبیں ہزاروں کشتیاں اُمّید کی مگر

دریائے زندگی کا کنارا نہیں مِلا

اوج و کمال جس میں ہوں لیکن نہ ہو زوال

ایسا کوئی بھی بخت کا تارا نہیں ملا

پھر دل میں کیسے لوٹتے وہ اشک جو بہے

پلکوں کا بھی تو اُن کو سہارا نہیں مِلا

تھے وہ بھی جستجو میں غمِ جاوِداں کے ساتھ

لیکن پتہ کسی کو ہمارا نہیں مِلا

یحییٰ بہانے اُن کو منانے کے تھے ہزار
اُن سے مگر مزاج ہمارا نہیں ملا

ہر اک نظر ترے جلووں سے سرفراز رہی

اَدائے حُسن بہر حال پاک باز رہی

دئے ہیں دھوکے تجلّی نے بار ہا مجھُ

نگاہِ شوق تصوّر سے بے نیاز رہی

تھی بے نیازی تری، یا کہ میری خودداری

نیاز و ناز میں جو وجہ امتیاز رہی

ملی صلہ میں وفا کے مجھے خلش دل کی

جفائے ناز بہ اندازۂ نیاز رہی

نظر نظر نے بندھایا ہے آسرا دِل کا

ادا ادا غمِ پنہاں کی چارہ ساز رہی

ہوئی اثر سے نہ خالی کبھی نظر میری
وفورِ غم سے طبیعت مری گداز رہی
کسی طرح نہ ہوا حالِ دِل عیاں یحییٰ
زباں کے ساتھ نظر بھی امینِ راز رہی

اِس قدر بھی نہ ہو مایوسِ کرم قسمت سے
شامِ غم آئی تو کیا، اِس کی سحر بھی ہو گی



غم بھی ہو گا، تپشِ سوزِ جگر بھی ہو گی
راہِ الفت میں وَفا خاک بسر بھی ہو گی

کانپ اٹھے گی اجل دیکھ کے حسرت کی نظر
آہِ آخر لئے تاثیر و اثر بھی ہو گی

میں تو اٹھ جاؤں گا دُنیا سے وفا کی خاطر
لیکن اُن کو مرے مِٹنے کی خبر بھی ہو گی

اس قدر بھی نہ ہو مایوسِ کرم قسمت سے
شامِ غم آئی تو کیا اِس کی سحر بھی ہو گی

ان کے اندازِ جفا سے نہ ہو یکسر مایوس
تجھ پہ اک روز محبّت کی نظر بھی ہو گی

یہ رُودادِ دل مختصر ہو رہی ہے
شبِ غم کی میرے سحر ہو رہی ہے

وہ اب ڈھونڈتے ہیں کرم کا بہانہ
محبت مِری با اثر ہو رہی ہے

کہاں ہیں کہاں اُن کی چشمِ عنایت
نہ ہوتی تھی مجھ پر مگر ہو رہی ہے

تصوّر ہے تیرا اور تنہائیِ غم
یونہی زندگی اب بسر ہو رہی ہے

میں رُودادِ غم کہہ رہا ہوں کہ ہچکی آئی
یہ توہینِ دردِ جگر ہو رہی ہے

قِطعات

قطعہ

شوق کی چاک گریبانی میں کیا رکھّا ہے
میں نے ہر درد کو سینے سے لگا رکھّا ہے
تاکہ دُنیا کو ہو نظارے سے عبرت حاصل
میں نے زخموں ہی سے اِک باغ سجا رکھّا ہے

قطعہ

اِک لمحہ خوشی، اِک لمحہ غمی، گر گر کے سنبھلتے رہتے ہیں
افسانۂ ہستی کے یونہی عنوان بدلتے رہتے ہیں
اِنسان مشیّت کے آگے مجبور بھی ہے، مایوس بھی ہے
جس سانچے میں ڈھالے وہ بیکس اُس سانچے میں ڈھلتے رہتے ہیں

قطعہ

نغمۂ درد سُناتی ہے ہر اک آہِ سرد
ہر نظارہ نظر آتا ہے مجھے دردہی درد
کیا یہی دہر میں ہے زیست کا حاصل یا رب
ہر نظر خون میں ڈوبی ہی ہر اک چہرہ زرد

قطعہ

یوں تو ظاہر میں ہر اک خوش ہی نظر آتا ہے
غم کو سینے میں مگر اپنے چھپا رکھا ہے
پھر پتہ چلتا ہے انسان کی مجبوری کا
جب کوئی دردِ تمنّا سے تڑپ اُٹھتا ہے

چھایا رہتا ہے ہر اک سمت تباہی کا غبار
خاک اڑتی ہے وہاں پھول ہی باقی ہیں نہ خار
ایسی اجڑی ہوئی بستی کے ہیں ساکن یحییٰ
جہاں بستی ہے خزاں اور نہیں آتی ہے بہار


Adamji -10-'58

قطعہ

چھایا رہتا ہے ہر اک سمت تباہی کا غُبار
خاک اُڑتی ہے وہاں پھول ہی باقی ہیں نہ خار
ایسی اُجڑی ہوئی بستی کے ہیں ساکن ہم بھی
جہاں بستی ہے خزاں اور نہیں آتی ہے بہار

قطعہ

ہے ابھی سینے میں میرے دلِ پُر غم باقی
جس کے دم ہی سے اُمیدوں میں ہے کچھ دم باقی
ناز برداریٔ معشوق میں کیا کیا گذری
ہائے اب یاد بھی اُس کی نہیں ہمدم باقی

قطعہ

ویران تصوّر ہے، دِل آباد نہیں ہے
میں صید ہوں لیکن مرا صیّاد نہیں ہے
گر دیکھ لوں اُس کو تو میں پہچان لوں بےشک
وہ کون تھا، کیسا تھا مجھے یاد نہیں ہے

قِطعہ

کوئی شئے عالمِ اسرار کی بے کار نہیں
پیدا ہوتا ہے اندھیرے سے اُجالے کا یقیں
نیکی کے حُسن میں ہوتا ہے اضافہ جس سے
ہے بدی ہستی کے رُخسار کا وہ خالِ حسیں

قطعہ

خودکشی

شبِ فراق کی تنہائیوں سے اُکتا کر
تمہارے ملنے کی اُمّید آنکھ میں پا کر
اُمنڈ کے آ گئے، آنکھوں میں دل کو ٹھکرا کر
بہت تلاش کیا تم کو ہر طرف جا کر
نہ پایا جب تمہیں یاں بھی تو غم سے گھبرا کر
ٹپک کے پلکوں سے اشکوں نے خودکشی کر لی

متفرق اشعار

روتے میں کبھی ہنسنا، پھر غم سے تڑپ اُٹھنا
دیوانے کی یہ باتیں، دیوانے ہی سمجھیں گے



روتے میں کبھی ہنسنا پھر غم سے تڑپ اُٹھنا
دیوانے کی یہ باتیں دیوانے ہی سمجھیں گے

خواب میرا تو فقط خواب ہوا کرتا ہے
اُن کے ہر خواب کی تعبیر ہوا کرتی ہے

مجھے خاموش ہی رہنے دو بزمِ عیش میں ورنہ
زمانہ کیا کہے گا تم کو میری داستاں سُن کر

گئی جوانی تو پھر لوٹ کر نہیں آئی
بہارِ گُل تو نہیں تھی کہ بار بار آتی

وہ روٹھے اس طرح جیسے جوانی روٹھ جاتی ہے
دیا موقع نہ پھر کچھ دردِ دِل کے کہنے سُننے کا

حادثے ہوں قدم قدم پہ جب
باز آئے ہم ایسے جینے سے

فطرتِ حُسن ہے دو دِن کی خدائی پہ غرور
قسمتِ عشق ہے، فرقت میں پریشاں ہونا

کیا دِل کے لگانے کا یہ انجام ہے یعنی
یاں عشق پشیماں ہے وہاں حُسن پشیماں

ذوقِ نظّارہ کا سرمایہ بہت تھا پھر بھی
تم کو گر دیکھ نہ لیتا تو کمی رہ جاتی

بے چین فصلِ گل بھی ہے اہلِ چمن کے ساتھ
شائد اسے تلاش کسی دیدہ ور کی ہے

پاتا ہوں دردِ ہجر میں اب لذّتِ حیات
شائد سنور رہا ہے غمِ بے نوا مرا

یادِ ماضی بھی نہیں آتی ہے اب تو دل میں
جانے کس حال میں ہے دردِ تمنّا تیرا

جتنے جتنے وہ ہوئے بے رُخ دلِ برباد سے
اُتنی اُتنی بے بسی بڑھتی گئی اُمّید کی

جب دلِ پامال کی بڑھتی گئیں ویرانیاں
دیکھنے کی چیز تھی پھر مفلسی اُمّید کی

بے رُخی وجہِ تسلّی تھی مگر اب اے دوست
معذرت سے تری کچھ اور گماں ہوتا ہے

ہو کر تباہ حال رہِ اشتیاق میں
تصویر کھینچتا ہے تمہارے عتاب کی

یوں جلوہ گر ہے دِل میں مِرے پرتوِ جمال
جیسے فلک پہ روشنی ہو آفتاب کی

بس اِتنا ہی ہوا کہ نظر جُھک کے رہ گئی
ورنہ ہوئی نہ بات کوئی بھی حجاب کی

دیکھا تھا میں نے بھی کبھی بیداریوں میں خواب
یعنی بس اسقدر ہے حقیقت شباب کی

مجبور ہو کے خونِ جگر پی رہے ہیں ہم
بے کیف زندگی ہے مگر جی رہے ہیں ہم

گھٹا چھائی تو کب چھائی، نہ تھی اِک آنکھ بھی پُرنم
بہار آئی تو کب آئی، نہ تھا جب دیدہ ور کوئی

آج ہی ہو جائے مجھ سے جو بھی کچھ ہونے کو ہے
ورنہ کیا جانے کہ کل کیا لائے گی میرے لئے

بے اثر ہی سہی آہیں لیکن
دردِ دل کی مری آواز تو ہیں

جذبِ الفت کا اثر کہئے اسے بھی ورنہ
بے کسی پر مری اور اُن کا پشیماں ہونا؟

تری نگاہ میں اور برق میں ہے فرق اِتنا
کہ یہ تو گرتی ہے اور وہ گرائی جاتی ہے



ہزار برق نے گرنے کی مشق کی لیکن
ادا نہ آئی ترے مُسکرا کے آنے کی

تری نگاہ میں اور برق میں ہے فرق اِتنا
کہ یہ تو گرتی ہے اور وہ گرائی جاتی ہے

ہوتی بس میں یہ کائنات اگر
تجھ پہ صدقے اُتار دیتے ہم

پھریں تھیں نظریں تو کیا کیا شکایتیں تھیں ہمیں
ملیں جو نظریں تو سارے گِلے تمام ہوئے

یکساں روش اب ہم سے کہاں تک نبھاؤ گے
الفت میں گر ہے غم تو مسرّت بھی ہے ضرور

تمہیں چاہتا تھا تمہیں چاہتا ہوں
یہ کیا پوچھنا مجھ سے کیا چاہتا ہوں

چمکنے کو ستارا آج ہے بختِ تمنّا کا
گھٹا گھنگھور چھائی ہے خبر ہے اُن کے آنے کی

کچھ ایسے ہیں بے رحم یہ دنیا والے
کہ جینے کو بھی جی نہیں چاہتا ہے

نشاطِ بزم میرا، بخت میرا، ہر خوشی میری
نہ ہوتا کچھ بھی پھر میرا اگر میرے نہ تم ہوتے

کچھ ہو انجام مگر اب تو یہی حسرت ہے
آپ ہو جائیں مرے آگے میری قسمت ہے

شکوے تو بہت کچھ تھے دل میں، پر رعب محبّت کیا کہئے
وہ سامنے جس دم آئے تو، میں ساری باتیں بھول گیا

تیرے ہی چشم کرم پر ہے بھروسہ یارب
تو جو چاہے تو فضائے دلِ ویراں بدلے

میں کبھی دل کو، کبھی دل مجھے سمجھاتا ہے
اس طرح کٹتی ہیں تنہائی کی راتیں میری

اب کوئی شکل نظر میں نہیں جچتی اے دوست
تیری تصویر نگاہوں میں پھرا کرتی ہے

مجھے یہ ڈر ہے قیامت نہ ڈھائے پھر کوئی
ہے چشمِ مست میں تیری خمار تھوڑا سا

جنابِ شیخ کدھر بھول کر نکل آئے
یہ میکدہ ہے یہاں مے گسار رہتے ہیں

بھولی بھالی وہ ادا سے جام دینا آپ کا
توڑ کر توبہ کو اپنی پی گئے ہم بار بار

ترکِ دنیا سے ملا دین تو پھر کچھ بھی نہیں
لطف تو جب ہے کہ دنیا بھی رہے دین کے ساتھ

یادسے آپ کی کچھ لطفِ سکوں پاتا ہوں
ورنہ جینے کو تو میں یوں بھی جئے جاتا ہوں

پھر میں سمجھوں کہ مرا جذبۂ دل کام آیا
بات دل کی مرے گر آپ کے دل تک پہنچے

صبر وضبط اک نعمتِ یزداں ہے انساں کیلئے
یہ نہ ہوتی گر عطا تو زندگی دشوار تھی

تیری صحبت میں جو گذری بس وہی تھی پُربہار
ورنہ صدمے ہجر کے سہنے میں گذری زندگی

کوئی سمجھا نہ اِسے ایسا مُعمّہ ہے یہ
زیست مجبوری و حسرت کے سوا کچھ بھی نہیں

نشۂ مے میں سنبھلنا تو بہت آساں ہے
مستئ زر میں رہے ہوش بڑی مشکل ہے

مِنّت کو ہماری وہ کچھ اور سمجھ بیٹھے
ہم بے رُخی کو اُن کی دستورِ وفا سمجھے

کر کے تو کوئی دیکھے پابندیاں وفا کی
آنسو بہا رہے ہیں صبر و قرار میرے

کچھ اِس اَدا سے آئے وہ بزم میں سنور کر
جیسے کسی کے دل میں برقِ امّید چمکے

آپس کی یہ باتیں تھیں آپس میں سمجھ لیتے
تم نے اُسے دنیا میں افسانہ بنا ڈالا

کِتنی عجیب جُستجوئے زیست ہے مری
پایا ہے دردِ ہجر میں میں نے سکونِ دِل

ہر تمنا مٹ گئی خِلوت بنی سو ہانِ رُوح
جُھلملانے کیوں لگی یہ روشنی اُمّید کی

تاب نظروں میں تھی باقی نہ زباں میں جنبش
تھا عجب حال تمنّا کا تری محفل میں

بنایا تم کو خدا نے جو حسن میں یکتا
تو دی نگاہِ محبّت بھی بے اماں مجھ کو

کیا تھا یہ بڑی اُمّید سے حسین گناہ
کسے خبر تھی کہ الفت نہ راس آئے گی

دردِ الفت میں وہ تاثیر نہاں رکھتا ہوں
جب بھی چاہوں وہ پشیمانِ جفا ہو جائے

ایک تم ہو کہ ذرا سے میں بگڑ جاتے ہو
ایک ہم ہیں کہ ستم پر بھی ہنسا کرتے ہیں

زمانہ تھا کہ ہر اک بات تھی شہکار جب میری
وہی میں ہوں کہ دُنیا اب مجھے دیوانہ کہتی ہے

گذر چکی ہے وہ دل پر کہ بس خدا کی پناہ
معاف رکھئے بہ ظاہر عنایتوں سے مجھے

گُلوں نے نظریں جُھکالیں وفورِ غیرت سے
نقاب اُلٹ کے وہ آئے جو سیرِ گلشن کو

جب قیامت ہو جدائی کی گھڑی میرے لئے
اور بھی کیا اب قیامت کی کوئی تعبیر ہے

رازِ بے تابیِ غم کیسے چھپاؤں تجھ سے
شعر بن کر مرے ہونٹوں پہ فغاں آتی ہے

رہِ الفت میں مٹ کر بھی نہ چھوڑا آپ کا دامن
زمانہ خاک سمجھے گا مذاقِ عاشقی میرا

درد بن کر دل میں رہتے تاکہ راز افشا نہ ہو
اشک بن کر آنکھ میں آئے تو پھر رسوائی ہے

دلاتا ہے رخسار کی یاد ہر گل
مجھے سیرِ گلشن بھی کرنا ہے مشکل

پشیمان ہو کر جفاؤں پہ اپنی
وہ پہلو میں آئے جھجکتے جھجکتے

بنا دے مجھے سخت جاں اِتنا یا رب
کہ تھک جائیں وہ خود ستاتے ستاتے

بھنور میں ڈال دی تم نے نہ جانے کس ارادے سے
نہ سمجھا، ناخدا ہے کون کشتیٔ محبّت کا

خبر تھی مجھ کو کہ ایفائے عہد مشکل ہے
نہ جانے کیوں ترے وعدے پہ اعتبار کیا

وہ افسوں ہے مری آہِ رسا میں
کہ جب چاہوں اُنہیں اپنا بنا لوں

میں مفلس و بے نیاز اچھّا تونگری سے خدا بچائے
نہ جس سے ہو دردِ غم کا درماں میں ایسی دولت کو کیا کروں گا

وہ اعجاز دے دردِ الفت کو یا رب
انھیں پیار کرنے پہ مجبور کر دوں

تمہارے واسطے اُلجھا ہوا ہوں کانٹوں میں
وگرنہ باعثِ رشکِ بہار میں بھی ہوں

اُمّیدِ وصل نے یکسُو کیا محبّت کو
وگرنہ ہم تو گرفتارِ آرزو رہتے

جستجو سے ہمیں نجات ملی
تُم ملے ساری کائنات ملی

جب سے تم دِل میں آن بیٹھے ہو
ہم کو نظّارے سے نجات ملی

ہو تو سکتا نہیں یہ تیرے کرم کا بدلہ
صرف اک دل ہے جسے پیش کئے دیتا ہوں

ہے محبّت پر مدارِ زندگی
کیوں محبّت کی تمنّا چھوڑوں

جذبات کو اشعار میں ڈھالا یہ خطا کی
کہتا ہوں میں کچھ اور سمجھتے ہیں وہ کچھ اور

مزہ تیری جفاؤں کا نہیں جاتا نہیں جاتا
وگرنہ یوں تو ہونے کو ہوئی مجھ پر عنایت بھی

جو جوانی خزاں نصیب ہی
اس کی غمگیں بہار کیا کہنا

کہاں کا ضبطِ الم اور کہاں کا صبر و سکون
ذرا جو اُس نے نظر کی تو آنکھ بھر آئی

اب کس سے کیجئے مہر و محبّت کی آرزو
کیا ذکرِ غیر اپنے جب اپنے نہیں رہے

بڑھ رہے ہوں حادثاتِ درد و غم جب پے بہ پے
لمحہ بھر کو گر سکونِ دل مِلا تو کیا مِلا

بھولے بیٹھے تھے جس قیامت کو
اُن کے آتے ہی وہ بھی یاد آئی

کب تک جئیں گے اب ہم سائے میں حسرتوں کے
اُمّید جاوداں ہے اور زندگی ہے فانی

دیکھنا ہے تو محبّت کی نظر سے دیکھو
ورنہ اِس سے تو میں محرُوم نظر ہی اچھّا

جُھکا کر سر کو تیرے آستاں پر
بڑھا دی میں نے عظمت سنگِ در کی

دل نے مشکل سے بھلایا تھا جنھیں وہ صدمے
سامنا جب ہوا اُن کا تو وہ سب یاد آئے

جب اُن کی یاد آئی ہے فصلِ بہار میں
اِک جان پڑ گئی ہے شبِ انتظار میں

کتنی عجیب جستجوئے زیست ہے مری
پایا ہے دردِ ہجر میں میں نے سکونِ دل

اُن سے گلہ کروں میں تغافل کا یا نہیں
اُلجھن سی ہو رہی ہے مجھے امتیاز میں

دِل تو ٹھیرے گا مِرا، آئے گا اُن کو بھی قرار
التجائیں کہیں اُن کو نہ ستائیں میری

کبھی خوشی کے لئے ہیں، کبھی ہیں غم کیلئے
زباں ہیں اشک، محبّت کی گفتگو کیلئے